راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

جنوری 2016ء

مجھے وہ آنگن بہت یاد آتا ہے جس میں میرے ماں باپ کے قدموں کے نشان ہوا کرتے تھے۔

میں نے تیر کسی فن میں بھی نہیں مارا، ناکامی البتہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہوں۔

ممتاز شاعر اسلم کولسری سے عامر بن علی کی گفتگو

موجودہ دور میں مشاعرہ ڈرامہ بنتا جا رہا ہے۔ جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن تجربات مسلمہ حدود میں رہتے ہوئے کرنے ہوں گے۔ یہ بات نامور شاعر اور کالم نگار اسلم کولسری نے ارژنگ کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہی۔ مزید گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں صاحب کتاب کا تعارف اور کتاب کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔

ارژنگ: شاعری کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟

اسلم کولسری: میٹرک کے بعد جب گاؤں سے اوکاڑہ آیا تو جہاں میں رہتا تھا وہاں قریب ہی کالج کے چند طالب علم بھی رہتے تھے۔ انہی میں سیّد ناصر بھی تھے۔ میں ان دنوں پرائیویٹ کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔ سیّد ناصر سے میری دوستی کالج مشاعروں میں حصہ لینے تک تھی۔ وہ غزل کہتے تھے میں ان کی غزل میں بھی رائے دیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ستلج کاٹن ملز میں مشاعرہ ہوا۔ صدارت ڈپٹی کمشنر ساہیوال نے کی۔ مہمان خصوصی ناصر شہزاد تھے۔ سیّد ناصر جمعے کو میرے پاس آئے کہ مشاعرے میں شرکت کرنی ہے اور میرا نام بطور شاعر دے دیا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر کہا میں نے کبھی شعر کہا نہیں۔ سیّد ناصر نے بہت اصرار کیا تو میں نے غزل کہنے کی کوشش کی۔ اس طرح میں نے اپنا پہلا باقاعدہ شعر یہ کہا:

سوئے مقتل چل رہے ہیں پھر بھی محو رقص ہیں
ساز سے کچھ کم نہیں زنجیر کی جھنکار بھی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

ہم بھی تنکے چن رہے ہیں آشیانے کے لیے
گو نظر آتے ہیں طوفان کے آثار بھی

ہمیں سارے تجربات مسلمہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوں گے۔

پہلی بار جب سٹیج پر گیا تو ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن سامعین کی حوصلہ افزائی پر دوسرے شعر کے بعد سنبھل گیا۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اوکاڑہ میں پندرہ روزہ ادبی نشست ہوتی تھی وہاں راؤ جمشید علی خاں لے گئے۔ جہاں ایچ غلام صادق اور محمد اقبال، راؤ تحسین، سیف اللہ صاحب اور کچھ اور دوست کافی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسی طرح وہاں پروفیسر ممتاز محی الدین صاحب بھی تھے۔ ان کے ہاں محفل ہوتی تھی جس میں اسلم نجمی، انور چوہدری، یونس خان اور دوسرے دوست شریک ہوتے تھے۔ وہاں یہ شاعری پروان چڑھتی رہی۔ اس کے بعد ٹیچنگ چھوڑ کر عرفان فارمیسی میں آ گیا۔ جہاں ایڈووکیٹ حفیظ جاوید مرحوم، ڈاکٹر ضیاء الحق، ڈاکٹر سیّد خالد جو آج کل ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر ہیں۔ منور جاوید اور صوفی عبدالباری صاحب جو خود بھی شاعر تھے وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میں نے اپنی پہلی غزل اوراق کو بھیجی۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے واپس کر دی کہ یہ انداز بہت پرانا ہے۔ تب تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن بعد میں غور کرتا رہا ذہن اس طرف آمادہ ہو گیا۔ اس کے بعد شاعری کا رنگ بدلا اور غزل سامنے آئی جس کے دو شعر دوستوں نے پسند کیے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر ۱۷ • جنوری 2016ء • شمارہ نمبر 11

مدیر اعلیٰ ۞ عامر بن علی

مدیر ۞ حسن عباسی

مدیران اعزازی ۞ ڈاکٹر صغرا صدف ۞ ابرار ندیم ۞ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

نائب مدیران ۞ قمر ریاض (مسقط) ۞ نازاو کاڑوی

مدیرانِ معاون ۞ شازیہ نورین (جرمنی) ۞ ادریس لاہوری (ناروے)

مدیر منتظم ۞ زاہد محمود شمس

مجلس مشاورت ۞ محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ۞ ظفر خان (آسٹریلیا)

قانونی مشیر ۞ افتخار شوکت چوہدری 0321-6012211

ارژنگ دوست ۞ ارشد نذیر ساحل (سپین) ۞ آغا تنویر (کراچی)

کمپوزنگ ۞ زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ۞ نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ۞ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0331-4489310 - 0300-4489310

فہرست

حمد / حسن عباسی (پہلے حمدیہ شعری مجموعے ''سائیں'' سے چوتھی حمد) ' ۲

نعت / جوہر نظامی، خورشید بیگ میلسوی، غضنفر عباس سید، رضاء اللہ حیدر، عمران سلیم ' ۴

طنز و مزاح: ○ املا کی درستگی کے لیے لکھے خطوط اور اشرف جن / حافظ مظفر محسن ' ۵

مضامین: ○ بدقسمت نوجوان کی داستان / ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان ' ۷

○ میرا اعزاز......افتخار مجاز ' ۹

○ زاہد محمود شمس کا نعتیہ مجموعہ پیارے محمدؐ ' ۱۳

○ ادھا پہلوان / مظہر کلیار ' ۱۵

آپ بیتی: ○ شام و سحر کے درمیاں (پہلی قسط) / رئیس عباس زیدی ' ۱۷

کالم: ○ جاپان کا پرائمری نظامِ تعلیم / عامر بن علی ' ۲۱

افسانے: ○ آئینے سے گرا ہوا عکس / پشتون احمدزئی ' ۲۲

○ غم کی چنگاری / ناصر معروف ' ۳۱

انشائیہ: خوشامد / اظہر ادیب ' ۳۵

شاعری (غزل، نظم) ' ۳۷

شعری گوشے: بشیر رحمانی، ممتاز اطہر، لبنیٰ صفدر، حرا رانا، جواد شیخ، ' ۴۴

○ بقیہ انٹرویو / اسلم کولسری ' ۴۹

○ بقیہ انٹرویو / ڈاکٹر کوثر محمود ' ۵۲

مختصر ادبی خبریں ' ۵۷

تبصرۂ کتب ' ۵۹

نامہ ہائے احباب ' ۶۳

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

میں ہوں کچا کوٹھا سائیں
مار کسی دن پوچا سائیں
تو نے حمد کی بیل لگا دی
میں تھا ٹوٹا گملا سائیں
تیری ذات کتاب مکمل
میری ذات خلاصہ سائیں
ساری عمر پڑھا ہے میں نے
تیرا ایک پہاڑا سائیں
میں تو تیرے ہاتھوں میں ہوں
پھول بنا یا کانٹا سائیں
تو نے بارش میں رکھا ہے
میں خالی برتن تھا سائیں
اپنے رنگ میں رنگ دے مجھ کو
تو ہے رنگنے والا سائیں
تیرے گیت کا ساز مکمل
میری ذات کا چمٹا سائیں
تیری خاموشی میں مجھ سے
بات کرے ہے صحرا سائیں
تو ہے چہرہ تو آئینہ
تو کاجل کا ٹیکہ سائیں
بالوں میں سیندھور ہے تیرا
پیشانی پر بندیا سائیں
ناک کے ہر کوکے میں دیکھوں
میں تیرا لشکارا سائیں
نیند ادھوری ہو سکتی ہے
خواب مرا ہے پورا سائیں
میں نے تجھ کو دیکھ لیا ہے
میں ہوں کتنا اندھا سائیں
تو ہے دھوپ، دریچہ بھی تو
تو کمرہ، تو پردہ سائیں
گلیوں، بازاروں میں جا کر
تجھ سے مل آتا ہوں سائیں
کارِ زیست کو تیرے علاوہ
کون لگائے دھکا سائیں

کس سے مل کر پورا ہوگا
نقش مرا ہے آدھا سائیں
اپنی فوٹو جب کھنچوائی
اُس کے اندر تو تھا سائیں
میری مرضی کوئی نہیں ہے
میں ہوں تیرا چیلا سائیں
تیری یاد کا شہد لگا کر
اپنا انگوٹھا چوسا سائیں
میری گال پہ ٹھہرا آنسو
میرا ہے یا تیرا سائیں
اشک ستارے ٹانکے میں نے
تیرا سیا ہے کُرتا سائیں
تیرا کھیت سلامت جس میں
میں ہوں ایک بجوکا سائیں
تیرا پُتلا ہوں تو پھر کیوں
حال ہے میرا پتلا سائیں
کیا باندھی ہے وقت کی پُڑیا
اک گڑیا اک بُڑھیا سائیں
اچھا خاصہ ہوتا ہو گا
مجھ پر تیرا خرچہ سائیں
پھر بھی سب نقصان ہے میرا
تیرا کیا ہے بگڑا سائیں
بس میں بیچ رہی ہیں بچیاں
تیرا میرا قصہ سائیں
بوجھ گناہوں کا تھا سارا
جب بھی خود کو تولا سائیں
میری چھٹی بند نہ کرنا
چاہے سبق ہو کچا سائیں
تجھ پر پیار آئے تو خود پر
کیوں آتا ہے غصہ سائیں
کب تک کرتے رہیں گے یونہی
اک دُوجے کا پیچھا سائیں
مجھ پر ڈھول اُڑاتی گزرے
روز تمہاری بگھیا سائیں

تجھ کو دینے آیا ہوں میں
اپنی ذات کا پُرسہ سائیں
میں ہوں تازہ گھاس کی گٹھڑی
تیرا جہاں ہے ٹوکا سائیں
میں گارے کو گارا کرتے
ہو جاتا ہوں گارا سائیں
جب سے پیدا ہوا ہوں تب سے
کھینچ رہا ہوں بوکا سائیں
چلتے چلتے گر پڑتا ہوں
بوجھ زیادہ لادا سائیں
خود کو جب بھی بیچنے جاؤں
ملتا نہیں ہے ٹکا سائیں
میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے
میں ہوں کتنا شودا سائیں
اپنی ذات میں اُلجھا اُلجھا
میں ریشم کا گچھا سائیں
تیری کچھ باتوں پر میں تو
پڑ جاتا ہوں پیلا سائیں
تیرے علاوہ مجھ کو نہیں ہے
اور کسی سے خطرہ سائیں
میں نے جان حوالے کر دی
تو نے دل ہی رکھا سائیں
ایسی ویسی بات تو ہوگی
میں ہوں ایسا ویسا سائیں
بنتی ہے مزدوری میری
کھول کسی دن کھاتہ سائیں
بھیج دی اتنی بارش تو نے
رستے میں ہے دنیا سائیں
تیری تسلی کے ہوتے بھی
رہتا ہے کیوں کھٹکا سائیں
میں کمرے میں اُڑتی چڑیا
وقت ہے چلتا پنکھا سائیں
پال میں رکھا ہوا ہے کس نے
کس سے پڑا ہے پالا سائیں

پھولوں کے باغات بہا کر
لے جاتا ہے دریا سائیں
تیری دُنیا ہے تو مجھ کو
کیوں ہے اتنی چِنتا سائیں
لاکھوں دل چوری ہو جائیں
کیا ہے تیرا پہرہ سائیں
پھانسی گھاٹ کا منظر بھی ہے
تیری دُنیا جیسا سائیں
میں برباد بساؤں کب تک
تیرا اُجڑا کوچہ سائیں
میرے چلنے سے چلتا ہے
تیرا سارا دھندہ سائیں
میں جو مر جاؤں تو تیرا
خالی پڑا ہو جھولا سائیں
اتنا ڈرایا ہے مُلّا نے
اب تو ڈر نہیں لگتا سائیں
ہم نے تو بس باری دی ہے
کھیل تو، تو نے کھیلا سائیں
میں ہوں تیرے کھیت کا گنا
جانتا ہوں کیا ہوگا سائیں
دونوں جہاں بیلوں کی جوڑی
پھالہ بھاری، ہل کا سائیں
اپنا مال اُٹھا لے واپس
منڈی میں ہے مندہ سائیں
تجھ سے بات وہاں کیسے ہو
مسجد میں ہے مُلّا سائیں
کون مٹا جاتا ہے میرا
دیواروں پر لکھا سائیں
اک لڑکی کو دیکھ کے میرا
دل کیوں زور سے دھڑکا سائیں
تجھ کو ڈھونڈ رہا ہوں ہر سُو
تیرا لے کر خاکہ سائیں

رام نے کس کی قوت سے ہے
تیر کمان میں کھینچا سائیں
راون کے قبضے میں کیوں ہے
ہر اک دور کی سیتا سائیں
کس نے پیدا کیا ہے بن میں
راون، رام کا جھگڑا سائیں
چونچ سے پنجرہ کاٹ رہا ہے
گھر گھر جنگلی طوطا سائیں
کوئی چیتا کھا جاتا ہے
روز ہرن کا بچہ سائیں
جیون ریڑھا کھینچ نہ پاؤں
بوجھ گرا دے ہلکا سائیں
دیکھ رہی ہے بچوں کے سنگ
عورت رستہ بس کا سائیں
مزدوری ملنے پر کتنے
خوش ہیں باپ اور بیٹا سائیں
کتنے بچوں کو رُلوائے
ایک کھلونے والا سائیں
تیری جانب دیکھ رہی ہے
توپ پہ بیٹھی چڑیا سائیں
کتنا سستا بیچ رہا ہے
تجھ کو ہر اک بندہ سائیں
کیا روکے گا میری شاخیں
تیری زمیں کا جنگلا سائیں
شکر ادا کرنے کی بجائے
ہو جاتا ہوں شوخا سائیں
مجھ کو خبر ہے تیرے آگے
پڑ جاؤں گا جھوٹا سائیں
تیرے ساحل پر جسموں کا
بکھرا ہے کیا سونا سائیں
آخر آنکھیں کب تک دیکھیں
شمس و قمر کا مجرا سائیں

ڈھونڈ لیا ہے میں نے تجھ کو
اب خود باہر آ جا سائیں
سائیں میری محبت شکوہ
عشق، گلہ ہے میرا سائیں
تیرا مجرم میں ہوں تو پھر
مجھ سے کیوں ہے چھپتا سائیں
چلے جائیں گے ہم سارے
ختم ہوا جب جلسہ سائیں
دوست سمجھ کر بات کروں تو
پڑ جاتا ہے رولا سائیں
کیسا دفتر ہے یہ تیرا
جس میں نہیں ہے ناغہ سائیں
سانس بھی لوں تو پڑ جاتا ہے
آئینے پر دھبا سائیں
تیرا گھر ہے کتنا اُجلا
میں ہوں کتنا میلا سائیں
تیرے علاوہ مجھ کمّی کا
کون اُٹھائے نخرہ سائیں
اک ہندو کا دل رکھنے کو
توڑ دیا ہے روزہ سائیں
کیسی نماز کہ مسجد میں تو
چڑھ جاتا ہے نشہ سائیں
تیرے علاوہ کون تھا میرا
تجھ سے لگ کے رویا سائیں
کون سی ''ہٹی'' سے ملتا ہے
تیرے تھان کا کپڑا سائیں
دھکا لگا کے چھوڑ دیا ہے
تو نے زیست کا ٹھیلہ سائیں
کیسا خوف کہ انگلی میں ہے
تیرے نام کا چھلّہ سائیں
تیرے علاوہ کون اُٹھائے
میری ذات کا کچرا سائیں

درسِ محبت دینے آیا درس محبت دے کے گیا
کیا کیا نعت لے کر آیا کیا کیا نعت دے کے گیا
نیرِ اعظم بن کر چمکا خاک کے اک اک ذرّے پر
دل والوں کو گرمیِ وحدت سوز و حرارت دے کے گیا
جو کچھ تیرے منہ سے نکلا اصل میں ہے قرآن وہی
اور لوحِ محفوظ وہی ہے تو جو دولت دے کے گیا
تیرے فیض سے خاک نشیں بھی اوجِ ثریا تک پہنچے
جاہل گلّہ بانوں کو تو نورِ بصیرت دے کے گیا
کون ہے جس نے دنیا کو اخلاق کا زیور پہنایا
کون ہے جو انسانوں کو آئینِ شرافت دے کے گیا
ختمِ رسل کے رُتبے کا عرفان کسے ہو سکتا ہے
جوہرؔ فرش کی پستی کو جو عرش کی رفعت دے کے گیا

جوہر نظامی/ جوہرآباد

بجز اس کے نہ کوئی لب پہ حرفِ مدعا لکھوں
خدا کی حمد لکھوں اور نعتِ مصطفیٰ لکھوں
درودِ پاک کا ہو ورد جاری میرے ہونٹوں پر
حبیبِ کبریاؐ کی جب بھی توصیف و ثنا لکھوں
عقیدت کا، محبت کا، فراست کا تقاضہ ہے
ہر اک دل کے ورق پر اک حدیثِ مصطفیٰ لکھوں
یہی ایمانِ کامل ہے، یہی ایقانِ کامل ہے
خدا کے بعد ان کو ارفع و اعلیٰ سدا لکھوں
قلم جب بھی اُٹھاؤں مدحتِ سرکارؐ کہنے کو
محمد مصطفیٰ صلِ علیٰ، صلِ علیٰ لکھوں
نبیؐ کا واسطہ دے کر مناؤں اپنے مولا کو
پھر اس کے بعد اپنے لب پہ میں حرفِ مدعا لکھوں
ثنا خوانِ محمدؐ میں مرا بھی نام آ جائے
انہیںؐ خورشیدِ رحمت، شافعِ روزِ جزا لکھوں

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

گدائے کوئے مدینہ تجھے مبارک ہو
یہ رحمتوں کا مہینہ تجھے مبارک ہو
گل و سمن سے مہکتے ہوئے جہاں کے چمن
مرے نبیؐ کا پسینہ تجھے مبارک ہو
مثالِ کشتیِ نوحؑ نبی ہیں آلِ عباؑ
سو عاقبت کا سفینہ تجھے مبارک ہو
جو منسلک ہے فقط اسوۂ رسولؐ کے ساتھ
وہ زندگی کا قرینہ تجھے مبارک ہو
مجھے بہت ہے دو عالم میں نسبتِ کوثر
غرورِ نسلِ زرینہ تجھے مبارک ہو
نصیبِ اہلِ زمانہ کو شوقِ لعل و گہر
یہ آنسوؤں کا خزینہ تجھے مبارک ہو
مرا تو زر ہے غضنفرؔ فقط رضائے نبیؐ
یہ اجرِ نعتِ شبینہ تجھے مبارک ہو

غضنفر عباس سیّد/ ساہیوال

آنکھ والوں کے لیے جانِ ثمینہ ٹھہرے
اُن کی پیشانی پہ جو آ کے پسینہ ٹھہرے
ڈال دے قدموں میں گلہائے عقیدت سارے
روبرو آپ کے جب دل کا سفینہ ٹھہرے
ہیں خسارے میں جو اغیار کی جانب دیکھیں
منتہا اہلِ نظر کا تو مدینہ ٹھہرے
یا نبیؐ آپ کی یادوں کی عطا جاری ہے
روح کے قریے میں پھر لطفِ سکینہ ٹھہرے
لے کے آ جاتا ہے سو سال کی یادیں مہکی
شہرِ پُرنور میں جو ایک مہینہ ٹھہرے
آرزو دل کی رضاؔ اشکوں میں ڈھلتی دیکھی
حاضری ہو تو یہی حسنِ قرینہ ٹھہرے

رضا اللہ حیدر/ اوکاڑا

گدائے شہرِ محمدؐ جو نام ہو جائے
رہِ حیات کا ہر غم تمام ہو جائے
وہ جانتے ہیں مرے دل کی بے قراری کو
نجانے کیا یہ ہوا خوش خرام ہو جائے
بہشت چومتی پھرتی ہے نقشِ پائے رسولؐ
خدایا میرا بھی کچھ انتظام ہو جائے
زمانہ آج بھی امن و سکوں کا ہو مسکن
یہ شرط ہے کہ نبیؐ کا غلام ہو جائے
جکڑ لیا ہے گناہوں نے میرے جیون کو
کرم کی ایک نظر ذی مقام ہو جائے
پھر اُس کے عیب بھی اعزاز ہیں ہنر کے لیے
درِ حضور پہ جس کا قیام ہو جائے
اگر مدینے کی آب و ہوا ملے تو سلیمؔ
گناہگار پہ دوزخ حرام ہو جائے

عمران سلیم/لاہور

طنز و مزاح

''املاء کی درستگی کے لیے لکھے خطوط اور اشرف جن......''

حافظ مظفر محسن/لاہور

''زلزلے اور دیگر قدرتی آفات'' ''میری بد اعمالیوں'' کا نتیجہ ہیں'' ...... ایک ''بہت بڑے'' سیاستدان نے کہا...... مجھے لگتا ہے یہ کمپوزنگ کی غلطی ہوگی کہ موصوف نے ''اتنی بڑی'' ذمہ داری اپنے سر لے لی...... مجھے لگتا ہے وہ کہنا چاہ رہے ہوں گے کہ ''زلزلے اور دیگر قدرتی آفات'' ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، اور یہاں ''میری'' غلطی سے لکھا گیا اور معاملہ عجیب شکل اختیار کر گیا یا شاید یہ میں نے غلط پڑھا...... (کیونکہ جس دن سے زلزلہ آیا ہے اور میں نے پنکھا اپنی آنکھوں سے جھولتا دیکھا ہے میرا سر بھی ہر وقت گھومتا محسوس ہو رہا ہے) چلیں اگر یہ ''اُن'' کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے تو شکر ہے کہ ہمارے ''بڑے بڑے'' سیاستدانوں نے اپنی غلطیاں تسلیم کرنا شروع کر دیں...... یعنی نئی سمت چل پڑا ہے ہمارے سیاستدانوں کا مزاج......؟ ویسے اب کون سا وہ باز آ جائیں گے...... اب آنے والی امداد پر ''ہاتھ صاف'' کریں گے......؟ کیونکہ چالیس سال پہلے جب ''پٹن'' (قبائلی علاقوں) میں جو بڑا زلزلہ آیا تھا تو اُس سلسلے میں آنے والی باقی امداد کا تو پتہ نہیں...... لوگ بتاتے ہیں کہ گھی کے لاکھوں ڈبے تو خیر سے لاہور میں ہی عام مارکیٹ میں فروخت ہوئے تھے......؟

آج سے پندرہ سال پہلے...... دراصل جب کاتب حضرات لکھا کرتے تھے تو کئی بار اخبارات کی بڑی سرخیوں پر بھی اعتراض اُٹھ جاتا تھا...... میں ملک کے بڑے اخبار کے ایڈیٹر جناب جبار مفتی صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ لاہور اور پھر ''پھڑ بازی'' کا ذکر چل نکلا...... ''جب سے میں نے ایڈیٹر شپ سنبھالی ہے مظفر صاحب کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ کپتان اچھا ہو تو شپ بھی منزل پر وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہے۔'' اس دوران میں اخبار کی ورق گردانی بھی کر رہا تھا اور مفتی صاحب کی باتیں بھی سن رہا تھا......

مفتی صاحب یہ کون سا سال ہے......؟

یہ 2010ء ہے......

آج کا اخبار چیک کیا آپ نے......؟ مفتی صاحب کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہوا دسمبر کے مہینے میں...... رنگین صفحات پر مشتمل ایڈیشن پر سال 2009ء چھپا ہوا تھا ...... (شکر ہے چیف ایڈیٹر صاحب اس وقت بغرض علاج ہسپتال میں داخل تھے ورنہ ....؟ آپ جانتے ہیں)۔ کہیں یہ ایڈیشن پچھلے سال والا ہی تو شائع نہیں ہو گیا...... SAME TO SAME ہے اس میں آپ کا مضمون بھی تو ہے اور پچھلے سال آپ کی پوسٹنگ لاہور میں تھی ملتان میں نہیں...... مفتی صاحب نے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا...... اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اب تعلیم مہنگی بھی ہے اور ''عام'' بھی بس ذرا مشکل ہے لیکن ہمارے دور میں ہم فزکس، کیمسٹری تک یا سکول میں پڑھتے تھے یا پھر خود ہی گھر آ کر ''ٹکریں'' مارتے تھے اور میٹرک میں بہت اچھے نمبر بھی آ جاتے تھے لیکن آج کل بچوں کو اردو، ہسٹری کی بھی ٹیوشن رکھنا پڑتی ہے ہمارے ہمسائے میں اشرف، جن بچوں کو اردو کی ٹیوشن پڑھاتا تھا...... پھٹیچر سائیکل پر آیا تھا...... جس فیکٹری میں وہ سائیکل بنی تھی اُسے خیر سے بند ہوئے بھی تیس سال ہو چکے تھے اکثر سائیکل پنکچر ہوتی اور موصوف گھسیٹتے چلے جا رہے ہوتے......؟

مرزا صاحب کی بیٹی بیٹھک میں بیٹھ کر ٹیوشن پڑھتی تھی...... ایک دن ہم گزر رہے تھے کہ اشرف جن پڑھا رہا تھا...... ملاحظہ ہو......

''پہلی محبت'' کے بارے میں......؟؟ ہمارے بڑے ملک صاحب کا...... اوہ سوری میر تقی میر صاحب کا وہ شعر ہے ناں......

ناز کی اُس کے لب کی کیا کہیے\
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے\
ملک ان نیم باز آنکھوں میں\
ساری مستی شراب کی سی ہے

میں ڈر گیا...... یہ اشرف جن بچی کو کیا پڑھا رہا ہے...... کچھ دن بعد پتہ چلا کہ اشرف جن اب پھٹیچر سائیکل ''بریلے'' پر (گھنٹی والی) ٹیوشن پڑھانے نہیں آتا۔ مرزا صاحب کی LATTEST ماڈل گاڑی اُسے لینے اور چھوڑنے جاتی ہے...... ہمیں خوشی ہوئی کہ جلد خوشخبری آ جائے گی یعنی بیٹی کے میٹرک میں بہت اچھے نمبر آ جائیں گے کم از کم اردو میں تو وہ بورڈ میں ٹاپ کرے گی...... لیکن خوشخبری تو آئی مگر وہ رزلٹ امتحان کا نا تھا وہ شادی کارڈ کی صورت میں...... ''نتیجہ'' ہمارے ہاتھوں میں تھا...... ملک میاں محمد اشرف المعروف اشرف جے کی شادی ہونا قرار پائی ہے...... شادی کے بعد اشرف جن نئے ماڈل کی کرولا پر آتا جاتا تھا اور اب وہ ٹریک سوٹ پہن کر ''بڑے پارک'' میں روزانہ ''جاگنگ'' کرتا ہے اور سردیوں میں فائیو سٹار ہوٹل میں ''سویمنگ'' بھی کرتا ہے اور ''بھاٹی لوہاری'' والے بچپن کے دوستوں اور ایک پھٹیچر سی ماڈل گرل کے ساتھ چائے بھی پیتا ہے...... اصل میں ''پہلی محبت'' والا جو

CONCEPT ہے ناں اُس نے نسلوں کا بیڑہ غرق کر دیا ہے...... نو عمر لڑکیوں کو کون بتائے کہ ''پہلی محبت'' کا یہ مطلب نہیں کہ کھوتا گھوڑا میں فرق ہی محسوس نہ کیا جائے...... کاش مہینوال زندہ ہوتا تو میں اُس سے درخواست کرتا کہ وہ کسی چینل پر گانوں کے وقفے کے دوران ''محبت کے اسرار و رموز اور دور جدید'' کے موضوع پر لیکچر دے اور ''سوہنی'' سے گزارش کرتا کہ وہ اس دور کے گانوں کا ترجمہ کرے جو وہ دریائے چناب کے کنارے، مہینوال کی یاد میں گایا یا سنایا کرتی تھی...... اور اگر اُس نے کوئی LOVE LETTER بھی سنبھال کے رکھے ہوں تو وہ بھی نئی نسل کو دکھائے اور چیدہ چیدہ پڑھ کے بھی سنائے...... کہ نسلوں کی اصلاح بہر حال ''تجربہ کار'' لوگوں کی GUIDANCE سے ہی ہو سکتی ہے......

ہمارے دوست اظہار شاہ کے تین تھیلے اُن خطوط کے پکڑے گئے جو وہ اسکول کے زمانے میں اپنی محبوباؤں کو لکھا اور وصول کیا کرتے تھے...... ''ہماری بھابھی'' صاحبہ نے ہماری درخواست پر اظہار شاہ کو معاف کر دیا کہ وہ خطوط اُنہوں نے ''اپنی املاء کی درستگی کے لیے لکھے تھے اور اُن میں ''منٹو'' کے افسانوں جیسی کی کوئی بات نہ تھی البتہ جھوٹے عہد و پیمان تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''جھوٹے'' ہی ثابت ہوئے...... ورنہ اُن میں سے اکثر لڑکیاں یوں والدین کے گھر بیٹھی بیٹھی بوڑھی نہ ہو جاتیں......؟؟؟!!!

ملکی حالات، عمران خان کی سنجیدگی اور مریم نواز صاحبہ کی امریکہ کے کامیاب دورے سے واپسی کے بعد یہ اشعار کہے ہیں...... ذرا دیکھیے......

پھر دھاندلی کا شور ہے اور ہم ہیں دوستو
دھرنے کا نیا موڑ ہے اور ہم ہیں دوستو
اس بار نئی چال چلا دشمن عزیز
بس دھاندلی پہ زور ہے اور ہم ہیں دوستو
تلقین صبر کی کئے جاتے ہیں بار بار
اس مشورے پہ غور ہے اور ہم ہیں دوستو
اس ''زندگی'' میں آئے چمک، روشنی بھی ہو
بے لطف بڑی بور ہے اور ہم ہیں دوستو

☆☆☆

مزاح راہ

☆ علی رضا احمد کا شگفتہ و فکاہیہ مضامین پر مشتمل تیسرا مجموعہ

☆ بقول ضیاء الحق قاسمی کہ ''علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ قیمت 300 روپے خوبصورت سرورق سے آراستہ

اُردو تحقیق صورتحال اور تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

پاکستان کے نامور سکالر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اُردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور اسے درپیش مسائل سے آگہی پر عمدہ کتاب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات کی ضروریات کے لیے انتہائی ممد و معاون

قریباً 5 صد صفحات قیمت: 700 روپے

چولستان تاریخ وثقافت

چولستان کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے اک اہم کتاب۔ اس خطے کے حکمرانوں، صوفیاء، اولیاء اللہ، فنکاروں، رسم و رواج، تاریخی عمارتوں سے روشناس کرایا گیا ایک مختصر مگر جامع کتاب۔

پروفیسر جاوید عثمان شامی کے قلم سے۔ قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ با قاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

بدقسمت نوجوان کی داستان

سٹیفن لیکاک/ وحیدالرحمٰن خان

میں اور آپ تو خیر گفتار کے غازی ہیں لیکن کچھ لوگ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی مدعا بیان نہیں کر پاتے۔ ان کے لیے فون پر گفت گو کے انقطاع اور حلقۂ یاراں سے الوداع کا مرحلہ خاصا دشوار ہوتا ہے۔ محفل میں جب وقتِ رخصت قریب آتا ہے اور مہمانِ عزیز اجازت طلبی کے لیے اپنی نشست سے ایک دم اٹھ کر گویا ہوتا ہے:

''اچھا، میرے خیال میں اب مجھے......''

اس پر میزبان از راہِ تکلف کہتا ہے:

''آپ ابھی تو آئے ہیں، کیا اتنی جلدی جانا ضروری ہے۔''

یہاں سے ایک دردناک داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

اس طرز کی ایک افسوس ناک مثال، میرے علم میں بھی ہے۔ اس سانحے کا تعلق میرے ایک یارِ عزیز سے ہے جس نے زندگی کی صرف تیئس بہاریں دیکھی تھیں۔ مذہبی رجحان کا حامل، دروغ گوئی سے متنفر، بدتمیزی سے مبرا، غرضے کہ اگلی شرافت کا نمونہ! ہوا یوں کہ ادھر موسمِ گرما کی تعطیلات کا آغاز ہوا اور ادھر وہ اپنے ایک عزیز کے دولت خانے کی طرف چل نکلا (جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا) گویا اگلے چھ ہفتوں کے لیے وہ ناکردہ کار ہو گیا۔

وہاں کچھ دیر اس نے باہمی دل چسپی کے امور پر بات چیت کی، چائے کے دو کپ نوش کیے، اس کے بعد کمرِ ہمت باندھی اور اچانک اعلان کیا ''اچھا، میرے خیال میں اب مجھے......''

لیکن خاتونِ خانہ نے جواب میں کہا ''ارے نہیں، جونز، کیا تم تھوڑی دیر اور نہیں ٹھہر سکتے۔''

اب جونز ٹھہرا ایک صاف گو انسان! گویا ہوا

''جی ہاں، یقیناً میں......ٹھہر سکتا ہوں۔''

''تو پھر برائے مہربانی مت جاؤ۔''

جونز واقعی ٹھہر گیا۔ اس نے چائے کے گیارہ کپ نوش کیے۔

شام گہری ہونے لگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شرماتے ہوئے کہا:

''میرے خیال میں، مجھے واقعی......''

''کیا تم واقعی جانا چاہتے ہو؟ میرا خیال تھا کہ تم رات کے کھانے تک ٹھہرو گے۔'' خاتون نے نرمی سے کہا۔

''اچھا، میں رک جاتا ہوں، اگر......'' جونز نے جواب دیا۔

''تو پھر پلیز، رک جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ میرا شوہر بہت خوش ہوگا۔''

اس نے نحیف سی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں ٹھہر جاتا ہوں۔''

وہ دوبارہ کرسی میں دبک گیا۔ وہ چائے اور بے چینی سی 'لب ریز' ہو چکا تھا۔

صاحبِ خانہ گھر واپس آئے تو سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ خورونوش کے دوران بھی وہ خیالی پلاؤ بناتا رہا کہ ساڑھے آٹھ بجے اٹھ آئے گا۔ ادھر تمام اہلِ خانہ سوچ رہے تھے کہ جونز کم عقل اور کم آمیز ہے یا صرف کم عقل!

کھانے کے بعد خاتون نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ جونز کو مائل بہ کلام کریں گی۔ انہوں نے اسے خاندانی نوادرات اور تصاویر دکھائیں۔ صاحب کے تایا اور ان کی بیگم کی تصویر، خاتون کے بھائی اور ان کے چھوٹے بیٹے کی تصویر، صاحب کے تایا کے دوست کی بنگالی یونیفارم میں ایک دل چسپ اور بارعب تصویر، صاحب کے دادا کے دوست کے کتے کی ایک دہشت ناک تصویر، رقص گاہ جاتے ہوئے صاحب کی 'لباسِ ابلیس' میں تصویر۔ ساڑھے آٹھ بجے تک جونز اکہتر تصویریں ملاحظہ کر چکا تھا اور بھی انہتر تصویریں 'نادیدہ' تھیں۔ جونز اٹھ کھڑا ہوا اور استدعا کی:

''اب مجھے اجازت دیجیے۔''

''اجازت! ابھی تو ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ کیا تمہیں کوئی کام کرنا ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' اس نے اقرار کیا۔ وہ منہ ہی منہ کچھ بڑبڑایا اور پھر اس نے ایک مجنونانہ قہقہہ لگایا۔

پھر ایک واقعہ رونما ہوا کہ گھر کے سب سے لاڈلے اور کھلنڈرے سپوت نے جونز کا ہیٹ چھپا دیا۔ اس پر صاحب نے کہا کہ اب تو اسے ضرور

ٹھہرنا چاہیے۔صاحب نے اسے سگارنوشی اور گپ بازی کی دعوت بھی دی۔ موصوف نے 'سگار' سنبھالا جب کہ 'گپ' جونز کے حصے میں آئی۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک وہاں موجود تھا۔

اسے ہر لحظہ فرار ہونے کا خیال آتا رہا لیکن فرار ہونے کی مجال نہ ہوئی۔ اتنی دیر میں صاحب اس سے بے زار ہو چکے تھے۔ آخر اکتا کر انہوں نے طنز لطیف کے انداز میں کہا کہ مناسب یہی ہے کہ جونز تمام رات یہیں قیام کرے۔ وہ اسے سونے کے لیے ایک بوریا دے سکتے ہیں۔ جونز ان کے جملے کے 'مرادی معنیٰ' کو سمجھنے سے قاصر رہا اور بہ چشمِ نم شکریہ ادا کرنے لگا۔ صاحب نے اسے ایک فالتو کمرے میں بستر کے سپرد کیا اور دل ہی دل میں لعنت ملامت کرتے رہے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد صاحب تو دفتر چلے گئے اور شکستہ دل جونز کو ایک بچے کے ساتھ کھیلتا ہوا چھوڑ گئے۔ اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ وہ تمام دن فرار ہونے کے ارادے باندھتا رہا لیکن کسی چیز نے اس کا ذہن جکڑ رکھا تھا اور وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ شام کو صاحب واپس آئے تو جونز کو دیکھ کر انہیں سخت 'ناخوش گوار حیرت' ہوئی۔ انہوں نے ہنسی مذاق میں اسے ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا ار ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے رہائش کا کرایہ لینا پڑے گا۔ ہا، ہا۔''

نوجوان پہلے ہی ناشاد تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے وحشت سے انہیں دیکھا، پھر ان کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ انہیں تھما دیا اور بچوں کی طرح سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگا۔

دن گزرتے گئے اور وہ زود رنج اور گوشہ نشین ہوتا گیا۔ اس دوران میں وہ ہمہ وقت ڈرائنگ روم میں ہی مقیم رہا۔ ورزش اور تازہ ہوا کی کمی نے اس کی صحت پر بُرے اثرات مرتب کیے۔ اس نے چائے پینے اور تصویریں دیکھنے میں وقت گزارا۔ اب وہ گھنٹوں کھڑے ہو کر صاحب کے تایا کے دوست کی بنگالی یونیفارم والی تصویر دیکھ سکتا تھا، اس سے باتیں کر سکتا تھا اور کبھی کبھی اس کی شان میں گستاخی بھی کر سکتا تھا۔ اس کا ذہنی توازن واضح طور پر بگڑ چکا تھا۔

آخر وہ حادثہ رونما ہو ہی گیا۔ اسے شدید بخار کے باعث بالائی منزل منتقل کر دیا گیا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اب وہ کسی کو نہیں پہچان پاتا تھا، یہاں تک کہ صاحب کے تایا کے دوست کی بنگالی یونیفارم والی تصویر کو بھی۔ وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھتا اور چلا کر کہتا ''اچھا، میرے خیال میں اب مجھے......'' اور پھر ایک بھیانک قہقہہ لگا کر پیچھے تکیے پر گر جاتا۔ پھر وہ دوبارہ اچھل کر بیٹھ جاتا اور چیختا ''چائے کا ایک مزید کپ، کچھ اور تصویریں، ہاں، ہاں، کچھ اور تصویریں۔!!''

جونز ایک ماہ جاں کنی کے عالم میں رہا اور جس روز موسمِ گرما کی تعطیلات کا آخری دن تھا، وہ جان سے گزر گیا۔ اہلِ خانہ نے بتایا کہ دم آخر وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دل کش اور پر اعتماد مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ گویا ہوا ''مجھے فرشتے آواز دے رہے ہیں۔ افسوس، اب مجھے واقعی جانا پڑے گا __ خدا حافظ!''

اس کی روح نے قفسِ عنصری سے یوں پرواز کی جیسے کوئی قیدی بلی، باغ کی دیوار سے چھلانگ لگا کر فرار ہوتی ہے۔

نعت

نہ اُن کی بخشش و عطا گداگروں سے پوچھیے
وہ کس قدر سخی ہیں بندہ پروروں سے پوچھیے

نہ بے کسوں سے پوچھیے وہ کس قدر رحیم ہیں
وہ کس قدر کریم ہیں ستم گروں سے پوچھیے

نہ مومنوں سے پوچھیے وہ کس قدر شفیق ہیں
وہ کس قدر خلیق ہیں یہ کافروں سے پوچھیے

نہ عاشقوں سے پوچھیے وہ کیسے خوش خصال ہیں
وہ کیسے خوش جمال ہیں یہ دلبروں سے پوچھیے

نہ ہم سے پوچھیے کہ ہم تو ان کے سب غلام ہیں
ہے کون فخر دوسرا یہ دوسروں سے پوچھیے

نجم الاصغر شاہیا (مرحوم) / ملتان

میرا اعزاز

افتخار مجاز/لاہور

☆ قدرت نے مجھے جن اعزازت سے نوازا ہے اُن میں سے میرا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اُس نے مجھے اعزاز احمد آذر کا بھائی بنایا ہے میں انہیں ہمیشہ سے اور ہر حوالے سے آئیڈیلاز (Idealize) کرتا آیا ہوں اور ان کی شخصیت ہمیشہ سے میرے لیے تخلیقی تحریک (Suorce of Inspiration) رہی ہے میں اپنی اس تحریر کے آغاز ہی میں ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آج پہلی مرتبہ میں اپنے ہاتھ سے ایسی تحریر لکھ رہا ہوں جس میں میں نے شروع ہی میں قارئین محترم کو بتا دیا ہے کہ میں جناب اعزاز احمد آذر کا (چھوٹا) بھائی ہوں وگرنہ اس سے بیشتر ہم دونوں یعنی اعزاز بھائی اور میں نے بہت ہی کم اس بات کا تذکرہ کیا ہوگا کہ ہم دونوں سگے بھائی اور ماں جائے ہیں ہم دونوں کے آپس میں بھائی ہونے کو منکشف نہ کرنے کی کوئی اور وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کبھی لاٹھی آگے بڑھنے کا حوالہ یا کوئی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے تھے اور یہ کہ ہمارے درمیان کوئی Memorandum of Understanding یعنی MOU یا مشورے سے طے نہیں ہوا تھا بلکہ آپ اسے زیادہ سے زیادہ Unsaid Agreement کہہ سکتے ہیں جو شاید ہمارے بہشت نشیں والدین کی تربیت اور خاندانی ماحول کا اعجاز و ثمر تھا تاہم ایسا بھی نہیں کہ ہم دونوں کے مابین سگے بھائی ہونے کے رشتے کا کسی کو معلوم ہی نہ ہو۔ بہت سے دوست احباب کو اس کا علم بھی ہے اور پھر انہی سے دیگر احباب کو آگے اس کی خبر اور علم ہوتا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت کی وجہ تسمیہ یہ ٹھہری ہے کہ مجھے انکی رحلت کے بعد اُنکی ذاتی زندگی کے حوالے سے انکے برادر خورد ہونے کے ناطے ایک غیر ادبی سی تحریر لکھنے کا حکم دیا گیا ہے میں یہاں ابتداء ہی میں ایک اور وضاحت بھی کر دوں کہ میری یہ تحریر بائیوگرافی کے زمرے میں بھی نہیں آئے گی اسلیے کہ مجھے انکی ذاتی زندگی کے حوالے سے جو دو چار باتیں لکھنی ہیں وہ کسی ترتیب سے نہیں ہونگی۔

☆ مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً میں چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تب ہم لاہور میں دریائے راوی کے اُس پار شاہدرہ ٹاؤن کی تاریخی بستی میں رہتے تھے اور یہ علاقہ شاہدرہ پنڈ کہلاتا تھا والد صاحب قبلہ کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی وجہ سے گھر کے معاشی حالات اچھے نہ تھے صرف آذر صاحب سے بڑے بھائی سرفراز صاحب ہی برسرروزگار تھے اور بس گزارہ ہی ہوتا تھا کہ بھائی جان سرفراز خود بھی ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے گھر میں معاشی آسودگی میسر نہ تھی چنانچہ آذر بھائی جہاں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھا کر بڑے بھائی جان کا ہاتھ بٹاتے تھے وہیں باضابطہ نوکری کی تلاش کے لئے بھی مارا مارا پھرا کرتے تھے انہی دنوں کا قصہ ہے ایف اے پاس اعزاز احمد آذر کو پولیس میں اے ایس آئی بھرتی کر لیا گیا معاشرتی سطح پر یہ ایک اعزاز اور گھریلو معاشی حالات کو بہتر بنانے کیلئے ایک اچھا موقعہ اور بہترین پیش رفت تھی مگر میرے والد صاحب قبلہ شریف احمد قریشی جو خود پولیس سروس سے ہی (قبل از وقت) ریٹائر ہوئے تھے نے آذر بھائی کو پولیس سروس جوائن کرنے کی اجازت نہ دی۔ آذر بھائی اگر تب پولیس سروس جوائن کر لیتے تو یقیناً اپنی صلاحیتوں ہینڈسم پرسنیلٹی اور ایک اُدھی شخص ہونے کے باعث بہت ترقی کرتے اور کم از کم ڈی آئی جی تو ضرور بنتے مگر والد صاحب نے معاشی تنگ دستی کے باوجود پولیس سروس کی ملتی ہوئی جاب جوائن کرنے سے منع کر دیا تو آذر بھائی نے سر تسلیم خم کر کے تلاش روزگار کا سلسلہ اُسی طرح جاری رکھا پھر مجھے یاد ہے کہ آذر بھائی کو ایک ایسے ادارے میں جاب ملنے کی امید پیدا ہوئی جو انکے ذوق کا بھی آئینہ دار تھا یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ آذر بھائی اپنے بچپن ہی سے شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے ممکن ہے کہ انکی دیگر دلچسپیوں اور مشاغل کا تذکرہ آئندہ سطور میں ہو۔

ہاں! تو میں بات کر رہا تھا اُن کو ایک ایسی جاب ملنے کی امید پیدا ہونے کی جو کسی نہ کسی طور انکے ذوق اور دلچسپیوں کے حامل ادارے میں تھی جاب تو یہ شاید جونیئر کلرک کی تھی مگر ایک بہت ہی باوقار ادارے میں جو فنون لطیفہ سے متعلق سرگرمیوں کا مرکز تھا یہ ادارہ تھا بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن یعنی بی این سنٹر جنرل ایوب خان کے عہد صدارت میں وزارت اطلاعات و نشریات کے تحت قائم ہونے والے اس ادارے کو بعد ازاں پاکستان نیشنل سنٹرز کا نام دیا گیا۔ جب آذر بھائی وہاں انٹرویو دینے گئے تب معروف شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر قیوم نظر اسکے ڈائریکٹر تھے اور اس وقت یہ ادارہ لاہور میں مال روڈ پر چائینیز لنچ ہوم سے ملحقہ عمارت میں تھا جہاں آجکل ٹائروں کی مارکیٹ اور ساتھ ہی پاک ٹی ہاؤس ہے۔ شومیٔ قسمت یہاں آذر بھائی ایک مرتبہ پھر جاب حاصل کرنے میں ناکام رہے مگر پروفیسر قیوم نظر ڈائریکٹر ادارہ ہذا نے آذر بھائی کو اعتماد میں لیکر اصل بات بتا دی ”نوجوان تمہارا انٹرویو Test تو محض رسمی تھا اصل بندہ تو ہم رکھ بھی چکے“ آذر بھائی بتایا کرتے تھے کہ یہ بتاتے ہوئے قیوم نظر صاحب کے چہرے پر ایک واضح کرب نمایاں تھا

جسے کم عمری کے باوجود انہوں نے (آذر بھائی نے) شدت سے محسوس کیا۔ آذر بھائی یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ میں جب یہاں سے بھی ملازمت کے لئے انکار سن کر دفتر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا تو میرے رخسار میرے آنسوؤں سے تر تھے گھر پہنچ کر میں کتنی ہی دیر دہلیز پہ کھڑا یہ سوچتا رہا کہ کچن کے پاس بیٹھی منتظر ماں کو یہ کیسے بتاؤں گا کہ آج پھر نوکری نہیں ملی ۔ تاہم وہ کہتے اُس روز وفاقی وزارت اطلاعات ونشریات کے اس ادارے میں جونیئر کلرک کے جاب نہ ملنا میرے لئے بہت مثبت ثابت ہوا اگر میں تب متذکرہ پوسٹ پر بحثیت جونیئر کلرک فائز ہو جاتا تو پھر شاید ساری زندگی کے لیے کلرک ہی بن کر رہ جاتا یا زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا۔ میں سینئر کلرک یا ہیڈ کلرک بن جاتا۔ مگر قدرت کا یہ فیصلہ اتنا احسن تھا کہ پھر وقت آنے پر میں اسی ادارے میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے پوسٹ ہوا۔ اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے طور پر ریٹائر ہوا۔ یہ جاب بلاشبہ آذر بھائی کے ذوق اور مزاج دونوں سے ہم آہنگ تھی شعروادب سیاست وصحافت اور ان شعبوں سے وابستہ لوگوں میں بھائی جان بہت آسودگی محسوس کرتے اسلئے پاکستان نیشنل سنٹر کی جاب کے دوران آپ ہمہ تن ، ہمہ وقت ادارے کی سرگرمیوں میں مصروف اور Involve رہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے خود کو ''فنا فل'' نیشنل سنٹر کیا ہوا تھا تو غلط نہ ہوگا ۔ یہاں انکے رفقاء میں ضمیر جعفری، احمد فراز، کشور ناہید صدیق طاہر، زاہد ملک، خالد رشید شہباز، غضنفر مہدی، کنور دلشاد، فرزانہ قریشی ۔ جیسے لوگ شامل تھے ۔ پھر آپ سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہاولپور، حیدرآباد اور گوجرانوالہ جہاں جہاں تعینات رہے ان علاقوں کے اہل دانش بلکہ Telented لوگوں سے ربط ضبط، تعلق اور دوستیاں ہوئیں جن پر آپ ہمیشہ نازاں رہتے اور انہی تعلقات اور دوستوں کو اپنا کل سرمایا اور اثاثہ سمجھتے اور اپنے اسی تعلق خاطر کی بناء پر وہ دوست احباب کی خوشیوں غمیوں میں ضرور شریک ہوتے آذر بھائی کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی بہت قابل توجہ اور باعث تحسین تھا اور وہ یہ کہ جس کام میں بھی دلچسپی لیتے اسمیں انتہا کر دیتے یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آذر بھائی کا بچپن اور لڑکپن زیادہ تر سیالکوٹ ، شیخوپورہ، چوہڑکانہ (فاروق آباد) جیا موسیٰ اور شاہدرہ جیسی بستیوں میں گزرا مگر انہوں نے اپنی ناپختہ عمر اور اسوقت کے ماحول کا کوئی اثر قبول نہ کیا کوئی فضول کھیل نہیں کھیلا کسی منفی سرگرمی میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ مثلاً بنٹے، اخروٹ، تاش گلی ڈنڈا حتیٰ کہ پتنگ بازی ان سب کھیلوں سے ہمیشہ دور رہے البتہ کرکٹ کھیلنے کا انہیں بے حد جنون تھا اور اس حوالے سے فسٹ کلاس لیول تک پہنچے تاہم گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے اس سے آگے اپنے کرکٹ کے اس شوق کو جاری نہ رکھ سکے البتہ شعروادب اور فن وثقافت بلکہ فنون لطیفہ سے انکا تعلق، وابستگی اور شغف بتدریج بڑھتا رہا اور یہ کہا بھی غلط نہ ہوگا کہ لاہور کی مضافاتی بستی ہونے کے باوجود شاہدرہ جو فنون لطیفہ کے حوالے سے اپنا کوئی تشخص نہ رکھتا تھا آذر بھائی اور انکے احباب کی وجہ سے قومی ادبی افق پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔ تب آذر بھائی کو شعروادب کا بڑا چسکہ تھا اور مقامی لوگ انہیں ''شاعر شور'' کہہ کر ہی بلاتے تھے تاہم اپنے ذوق اور محنت کی بناء پر وہ شاہدرہ میں ایک بہت بڑی مضبوط اور متاثر کن ادبی Empire بنانے میں کامیاب ہوگئے وہ برملا کہا کرتے تھے کہ شاہدرہ کو ایک بڑے ادبی مرکز کے طور پر Establish کرنے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوتے اگر انہیں یہاں معروف ترقی پسند افسانہ نگار، دانشور اور وکیل جناب سہراب اسلم کی رفاقت میسر نہ ہوتی سہراب اسلم صاحب کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آذر بھائی کے Comments بجا طور پر انکی اعلیٰ ظرفی کا اظہار کرتے ہیں پھر آذر بھائی نے سہراب اسلم صاحب کی محبت کے اعتراف میں انکے بکھرے ہوئے افسانوں کو جمع کیا اور یکے بعد دیگرے اُن کی دو کتابیں شائع کرائیں جن میں سے ایک کا نام'' تنکے کی ناؤ ''میرے حافظے میں آج بھی موجود ہے ۔ بر طور پھر ان دونوں دوستوں کو ادبی جوڑی نے مجلس احباب ادب کے نام سے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈال کر شاہدرہ میں ادب کی جوت جگانا شروع کر دی یہ 1960 کی دہائی کے غالباً آخری برسوں کا قصہ ہے جب آذر بھائی نے جناب سہراب اسلم کی معاونت میں ملک بھر سے بڑے بڑے اہم علم ودانش، ادباء، شعراء اور فنکاروں کے ساتھ خصوصی شاموں کا انعقاد کیا جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، عارف عبدالمتین، اے حمید، احمد بشیر، حمید اختر ایرک پرین، اعجاز بٹالوی، احمد فراز اشفاق احمد، میجر محمد اسحاق تنویر نقوی حزیں قادری، استاد دامن طفیل ہوشیارپوری منیر نیازی، حبیب جالب، مرزا ادیب، قاسم محمود، ستار طاہر، اظہر جاوید، مولانا حامد علی خاں، پروفیسر حمید احمد خاں، قمر یورش، اور اسلم کمال و دیگر بڑے قلمکار و فنکار جیسے اداکار محمد علی، اداکار حبیب، اداکار علاؤالدین فلم ڈائریکٹر پرویز مسعود اور خورشید انور میوزک ڈائریکٹر شامل تھے ان محفلوں کے باوصف مجھے بھی یہ اعزاز ملا کہ جہاں متذکرہ بالا اہل علم وفن کو چائے پانی پیش کرتا وہیں پہلی مرتبہ حمید جہلمی مرحوم، تنویر کاظمی، بی اے اسلم ،ائی اے رحمان، حسین نقی، بابا عالم سیاہ پوش، سیف الدین سیف اور دیگران کو پہلی مرتبہ دیکھا اور ان کی زیارت کی یہاں ایک بات کا تذکرہ میں ضرور کرنا چاہوں گا کہ جناب احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور ڈاکٹر وزیر آغا زندگی بھر اس امر کا تذکرہ کرتے رہے جو ریکارڈ پر بھی ہے کہ انکی زندگی کی پہلی ادبی شام مجلس احباب ادب شاہدرہ کے زیر اہتمام اعزاز احمد آذر نے منعقد کی یہاں مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب آذر بھائی نے

آج کے معروف و مقبول مزاحیہ شاعر انور مسعود کے ساتھ شام کا انعقاد کیا تب وہ اسقدر جانے پہچانے نہیں جاتے تھے بلکہ تب شاید انکی شاعری کی پہلی کتاب میلہ اکھیاں دا بھی ابھی شائع نہیں ہوئی تھی اسی طرح ایک اور بات مجھے یاد آرہی ہے کہ جناب محسن احسان، خاطر غزنوی، تاج سعید، زیتون بانو، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، واصف علی واصف، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، عبدالحمید عدم، احسان دانش، حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن، شیخ رفیق احمد، کوثر نیازی، حفیظ پیرزادہ اور دیگر کئی ممتاز لوگ آذر بھائی کے لئے یا انکے ساتھ ہمارے گھر میں آتے ہوئے میری بصارتوں اور قلب و ذہن میں اترے اور میرا ان سے براہ راست Interaction ہوا۔ مگر یہ سب آذر بھائی کی شعر و ادب اور سیاست وصحافت سے وابستگی کا ہی اعجاز تھا۔

اعزاز بھائی کا ایک اور کمال اور کرشمہ ہمیشہ سے یہ رہا کہ بقول شاعر جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے کے مصداق جہاں جاتے اپنا حلقہ احباب بنالیتے اور اگر اسے گستاخی سے تعبیر نہ کیا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ صنفِ لطیف میں آپ ہمیشہ زیادہ ہی مقبول و پسندیدہ رہے اور دو چار معروف خواتین ہمیشہ انکے حلقہ اثر میں رہتیں اور یہ ہماری باجی محترمہ مسز شمسہ آذر (جنہیں میں روز اول سے تادم تحریر باجی کہتا ہوں) کا بھی کمال حوصلہ اور ظرف ہے کہ وہ اس معاملے میں کبھی آذر بھائی کے راہ کی دیوار نہ بنیں یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کی دنیا میں کئی ممتاز خواتین شاعرات کی شاعری میں آذر بھائی کا تخلیقی رنگ و ہنر با آسانی پکڑا جاسکتا ہے تاہم میں یہاں چند ایسے ممتاز شاعر دوستوں کے نام ضرور لوں گا۔ جو آج ادبی افق پر اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں مگر اپنے آغاز شعر گوئی میں آذر بھائی کی رہنمائی کا بہت محبت اور احترام سے تذکرہ کرتے ہیں ان میں سے جناب لطیف ساحل، اشرف احسن، ظفر رباب، باقی احمد پوری، رمضان شاکر، ناصر بشیر، وجاہت مسعود، شاکر حسین شاکر، علی ظہیر منہاس، تسنیم کوثر اور ڈاکٹر رامش بطور خاص قابل ذکر ہیں آپ شاید جانتے ہوں اعزاز بھائی شگفتہ مزاجی بذلہ سنجی، برجستگی اور حاضر جوابی میں بھی لاجواب تھے مجھے یاد پڑتا ہے کہ کچھ برس پہلے جب آذر بھائی کی غزل

تم ایسا کرنا کہ کوئی جگنو کوئی ستارہ سنبھال رکھنا
میرے اندھیروں کی فکر چھوڑو بس اپنے گھر کا خیال رکھنا

اور نظم ،فرض کرو بہت مشہور ہوئیں اور کراچی ،حیدر آباد ، بہاولپور ، لودھراں ، خانیوال گوجرانوالہ سیالکوٹ اور دیگر شہروں میں ہونے والے مشاعروں میں ہر جگہ فرمائش کرکے سنی جارہی تھیں تو کسی دوست نے آذر بھائی سے کہا یار آذر تم نے جس طرح ہر شہر میں اپنا یہ کلام سنا کر مشاعرے لوٹے ہیں لگتا ہے جیسے تمام شہر تمہارے مفتوحہ ہوں آذر بھائی نے ترت سے جواب دیا ’’ہاں! سیالکوٹ کو نکال کر‘‘ دوست نے حیرت سے استفسار کیا وہ کیوں؟ آذر بھائی نے سنجیدگی سے جواب دیا یار وہ میرا مفتوحہ نہیں منکوحہ شہر ہے۔ یقیناً آپ سمجھ گئے ہونگے کہ مسز آذر بھائی کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔

اب اس تحریر کے اختتام پر میں ایک انکشاف کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جہاں آذر بھائی کی وجہ سے ادب کو کئی اچھے شاعر ملے وہیں آذر بھائی کی وجہ سے آپ ایک اچھے شاعر سے محروم بھی رہے ہیں آپ یقینا سوچ رہے ہوں گے وہ پس پردہ اور پیچھے رہ جانے والا شاعر کون ہے؟ آپ پریشان نہ ہوں میں آپکو بتا دیتا ہوں وہ شاعر میں خود یعنی بقلم خود افتخار مجاز ہوں اس کا پس منظر یہ ہے کہ شعر کہنے کی لت مجھے بھی ہے آغاز میں جب کہیں کسی تقریب مشاعرے یا مقابلے میں اپنا کلام پڑھتا اور داد یا انعام حاصل کرتا تو یہ جاننے والے کہ میں اعزاز احمد آذر کا چھوٹا بھائی ہوں جھٹ سے کہہ دیتے کہ بھائی سے لکھوا کر لاتا ہے چنانچہ میں نے دل برداشتہ اور بددل ہو کر شاعری کرنا ہی چھوڑ دی اور اپنے لئے نثر خصوصاً کالم نگاری و خاکہ نگاری کا میدان چن لیا مگر وہ جو کہتے ہیں ناں کہ

’’چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی‘‘

تو میرا معاملہ بھی کچھ کچھ یہی ہے کہ بہت باقاعدگی سے تو نہیں مگر کبھی کبھار جب شعر ہو جائے تو کہہ لیتا ہوں گویا ’’زندگی ڈھل گئی مشینوں میں شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں‘‘

آذر بھائی کے حوالے سے لکھنے کو تو میرے پاس بہت کچھ ہے مگر بالآخر کہیں تو اختتام کرنا ہے سو میں چند اور باتیں لکھ کر آپ سے اجازت چاہوں گا شعر و ادب کا منفرد حوالہ بھائی اعزاز احمد آذر جب پاکستان نیشنل سنٹر ملتان سے لاہور ٹرانسفر ہوئے تو وہاں انکے اعزاز میں منعقدہ الوداعی تقاریب میں انہی کے حوالے سے ایک جملہ تواتر سے کہا گیا کہ عام طور پر اعزاز دیے جاتے ہیں مگر ملتان سے اعزاز واپس لیا جارہا ہے اعزاز بھائی اپنے نام کی طرح ہی بہت منفرد اعزازات کے حامل رہے ہیں مگر عمومی زندگی میں انتہائی سادگی اپنائے رکھی گریڈ 20 میں ریٹائر ہوئے مگر تمام عمر 3 مرلہ کے گھر میں رہے جو دوران سروس اقساط پر خریدا تھا اور تادم مرگ اسکی اقساط ادا کررہے تھے اپنی ذات میں انجمن اور ہر فن مولا تھے۔ گھر میں کسی بھی نوعیت کا دستی کام ہوتا تو خود کرنے کو ترجیح دیتے گویا گھر میں ترکھان، مستری، راج، مکینک، الیکٹریشن اور پلمبر کے طور پر کام کرلیتے کک (باورچی) بہت اچھے تھے اور ہر طرح کے کھانے پکانے میں ماہر نہیں بلکہ کھلانے میں بھی بڑے فراخ دل تھے دستر خوان بہت وسیع تھا اور گھر میں احباب کو مدعو کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ اور حوالہ ڈھونڈ ہی لیتے ماضی کے ایام کا تذکرہ کروں تو تنویر نقوی، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی اداکار علاؤالدین طالش، استاد دامن اور کئی دوسرے انکے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے تناول فرمانے کیلئے ہمارے گھر تشریف لایا کرتے۔ شعر و

ادب میں انکا نام اور مقام کتنا بڑا اور انکا Contribution کیسا اور کتنا ہے یہ نقادان فن اور تحقیق کا موضوع ہے تاہم میں نے انہیں ہمیشہ سے ایک قلم مزدور کے طور ہی دیکھا ہر موضوع پر نظم و نثر میں قلم برداشتہ لکھنے کی صلاحیت سے مالا مال رہے ایک بڑے میوزک ڈائریکٹر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آذر صاحب کے گیت، غزلیں اور دیگر کلام کمپوز کرنا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ انکی ہر تخلیق اپنی کمپوزیشن ساتھ لیکر آتی ہے اور وہ خود بول رہی ہوتی ہے کہ اسے کس طرح کمپوز ہونا ہے آذر بھائی نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے لیے بہت لکھا بلکہ اب تو انکے گھر کا نان نفقہ اور رزق ہی قلم کی مزدوری سے وابستہ تھا اور انہی اداروں اور پرائیویٹ کمرشل تقریبات۔ میں کمپیرنگ سے ان کی روٹی روزی چلتی تھی کسی زمانے میں انہیں اداکاری کا بھی بہت شوق تھا۔ براڈ کاسٹر تو وہ ماشااللہ بہت ہی ورسٹائل تھے ہی کہ تلفظ اور الفاظ کی نشست و برخاست پر انہیں ملکہ حاصل تھا سٹیج کے علاوہ پی ٹی وی پر متعدد ڈراموں میں اداکاری بھی کی مگر یہ سب 1964 سے 1980 کے عرصہ کی باتیں ہیں اس کے بعد انہوں نے ان اداروں اور شعبوں کے لئے صرف لکھنے پر ہی توجہ مرکوز رکھی انکی تخلیقات میں مختلف چینلز کے لئے متعدد ڈرامہ سیریل اور سیریز بھی ہیں۔ جنکی کتابی صورت میں اشاعت کی بھی وہ بہت خواہشمند تھے۔ انکی 16/17 کتابوں کے علاوہ دو تخلیقات اور بھی ہیں یعنی ایک بیٹا اور ایک بیٹی ایک مرتبہ کسی نے آذر بھائی سے انگریزی میں پوچھا

Mr. Azer! How Many Kids You Have?

آذر بھائی نے پٹاخ سے جواب دیا

One kid and one Kidny

لفظ ''کڈ'' Kid کی رعایت سے انہوں نے بیٹی کیلئے کڈنی کہہ کر پوچھنے والے کی بولتی بند کردی تھی

آذر بھائی کی بذلہ سنجی اور برجستگی سے تو آپ یقیناً واقف ہو ہی گئے ہوں گے میں انکی آغاز شاعری کے زمانے کے دو شعر آپکی نذر کرتا ہوں زرا اُٹھان دیکھئے آذر بھائی تب 18/20 برس کے ایک نوجوان شاعر تھے۔

خالق بھی ہوں تخلیق مگر خود بھی ہوا ہوں
کھلتا ہی نہیں مجھ پہ بشر ہوں کہ خدا ہو
تو نے چھیڑا تو یہ کچھ اور بکھر جائے گی
زندگی زلف نہیں ہے کہ سنور جائے گی

اور آگے بڑھنے سے پیشتر میں ان کا ایک تازہ شعر آپکی خدمت میں بھی پیش کرنے کا خواہاں ہوں ۔ ذرا توجہ کیجئے

میرے دوستو میرے ساتھیو مجھے شہر سے کہیں لے چلو
میں اسیر حبس مدام ہوں میں کھلی ہوا کا سفیر تھا

اگرچہ گزشتہ سطور میں میں نے آپ سے اجازت لینے کی بات کی تھی مگر میں اب یہاں چند سطور کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں مجھے اجازت دیجئے! کالج کے کلاس فیلوز میں سے جناب عطاالحق قاسمی پر ہمیشہ ناز کرتے ڈاکٹر اجمل نیازی کی معصومیت والہانہ پن اور سادگی کے مداح تھے امجد اسلام امجد اور احمد فراز کی شاعری انکے دل کو بہت بھاتی تھی تنویر نقوی قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی کی اپنے لئے محبت کو اثاثہ اور مان قرار دیتے تھے ملتان کے دوستوں میں سے ڈاکٹر انوار احمد، اے بی اشرف، عرش صدیقی، غلام نبی اعوان، طاہر تونسوی، حسین سحر اور ڈاکٹر خیال امروہی کا تذکرہ کرنا کبھی نہ بھولتے تھے ادبی جرائد کے مدیران میں سے اظہر جاوید اور شاہد علی خان کی محبتوں کے اسیر تھے اپنے بعد آنے والے قلمکاروں میں سے وجاہت مسعود، فرخ سہیل گوئندی، ڈاکٹر اختر شمار، غافر شہزاد، لطیف ساحل اور کچھ دیگر دوستوں سے بہت پر امید تھے۔

ایک زمانے میں آذر بھائی نے لاہور میں وکالت بھی کی اس زمانے میں ملک اسلم حیات، رفیق احمد باجوہ، محمود علی قصوری، ملک حامد سرفراز، احسان وائیں، اکبر لاہوری سے بہت یارانہ اور نظریاتی وابستگی رہی تاہم پیشہ وکالت میں وہ دیس پنجاب محاذ کے صدر مشتاق بٹ ایڈووکیٹ کو اپنا استاد و محسن کہتے تھے۔ جنکی سعی سے آج پنجاب میں پنجابی کا تذکرہ ممکن ہوا ہے پنجابی زبان اور شعر و ادب کی جانب انکی رغبت توجہ اور دلچسپی کا باعث تنویر ظہور اور فخر زمان بھی بنے جو آذر بھائی کے لنگوٹیے یار تھے اور ہیں۔

اور اب واقعتاً حرف آخر، آذر بھائی ذوالفقار علی بھٹو کے بہت مداح اور قریبی ساتھی بھی رہے ہیں بھٹو صاحب نے جب پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی انہی دنوں آذر بھائی پارٹی میں شامل ہوئے تھے 1970ء کے انتخابات کے لئے انتخابی مہم کے دوران اور پھر 1977 میں بھی پارٹی کے لوگوں ڈاکٹر مبشر حسن، حنیف رامے، شیخ رفیق احمد افتخار تاری، ایس ایم مسعود، قیوم نظامی، اسلم گورداسپوری، عارف اقبال بھٹی اور دیگران کے ساتھ مل کر بہت کام کیا، انتخابات کے دوران بھٹو صاحب کے ہمراہ لاکھوں کے جلسوں میں گھن گرج کے ساتھ اپنی انقلابی نظمیں پڑھا کرتے آذر بھائی نے جتنی متحرک فعال اور بھرپور زندگی گزاری میری خواہش تھی کہ وہ اپنی یاداشتیں ضرور لکھتے لاہور کے ایک بڑے پبلشر نے بھی آذر بھائی سے یاد داشتیں لکھنے کا معاہدہ کرلیا تھا۔ اور وہ چند ابواب لکھ بھی چکے تھے مگر لکھی کون موڑے!

☆☆☆

زاہد محمود شمس کا نعتیہ مجموعہ کلام ''پیارے محمد ﷺ''

محمد نوید مرزا/لاہور

زاہد محمود شمس سے میرا تعارف چند ماہ قبل ہوا اور مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ موصوف نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ نثر نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ شمس کے دو شعری مجموعوں کے علاوہ بچوں کے لیے نظم و نثر کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اصل حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب انھوں نے اپنا نعتیہ مجموعہ ''پیارے محمد ﷺ'' میرے حوالے کیا۔ جس کے بعد میرے منہ سے بے اختیار نکلا'' واہ شمس واہ...... تم نے تو شعر کہنے کا حق ادا کر دیا۔ اتنی کم عمری میں نعتیہ مجموعہ شائع کروا کے اپنی بخشش کے سامان پیدا کر لیے۔

زاہد پر خدائے بزرگ و برتر کا خاص کرم ہوا ہے کہ اُس کی تخلیقی صلاحیتوں نے اُسے باطنی طور پر روحانی جذبوں سے سرشار کیا اور اب وہ اپنا نعتیہ مجموعہ ''پیارے محمد ﷺ'' لے کر ہمارے سامنے ہے۔ بقول عطاء الحق قاسمی ''نعت تو عطا کا معاملہ ہے زاہد محمود شمس اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اُس کی ذات پر خاص کرم ہوا اور نعت کا ایک در اُس کے دل میں کھل گیا۔ اُس نے محبت، عقیدت اور سرشاری کے جذبے سے لبریز ایسی دل پذیر نعتیں لکھی ہیں جن کو پڑھ کر روح معطر ہو جاتی ہے۔

شمس کی نعت میں عقیدت و احترام کے ساتھ خلوص، محبت، سادگی اور برجستگی کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ایک عجیب طرح کی روحانی بے خودی اور سرشاری ہے۔ جس میں شمس رنگوں اور خوشبوؤں میں بھیگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دل میں تڑپ ہے تو صرف مدینے کی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

دیکھ کر قافلہ مدینے کا
دل بدن سے نکلنے لگتا ہے

زاہد محمود شمس بہتے ہوئے جھرنوں جیسی شفاف شعری زبان میں خوبصورت نعتیں تخلیق کرتے جا رہے ہیں۔ بقول حسن عباسی شمس کے نعتیہ مجموعے ''پیارے محمد ﷺ'' کا اسلوب نہایت سادہ اور آسان ہے۔ اس میں جذبہ عقیدت اور محبت کی شدت ہے۔ مصرعہ مصرعہ مہکتا اور دمکتا محسوس ہوتا ہے۔

مجموعے کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا ایک کارِ مشکل ہے۔ ان کے چند اشعار دیکھیں جو انھوں نے بڑی سہولت اور آسانی سے کہہ دیے ہیں۔

ایسا محسن کہ مرے عیب عیاں کرتا نہیں
اور سجدے مرے ماتھے پہ سجا دیتا ہے

....

میرے مالک ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے یہ شمس
وہ جو سوئی ہوئی مٹی کو جگا دیتا ہے

''شمس''، عشق محمد ﷺ میں ڈوب کر عقیدت کے پھول چنتے ہوئے ایک طویل روحانی سفر پر رواں دواں ہیں اور ہر پڑاؤ پر ایک خوبصورت نعت تخلیق کرتے جا رہے ہیں۔

ان کی وابستگی ملی ہے مجھے
بس اسی بات کی خوشی ہے مجھے

....

اُس کی رہ میں نہ کیوں اُجالا ہو
جس کا رہبر مدینے والا ہو

....

مدینے کی جانب قدم جب اُٹھے گا
یقیناً یہ دل مجھ سے آگے چلے گا

اسی طرح کے خوبصورت نعتیہ اشعار کو پڑھتے ہوئے میری نظر کتاب میں شامل اُس کی ایک نعت پر پڑی جس میں اُنھوں نے اپنی پیاری بیٹی عائمہ کو مخاطب کر کے اُس کی طرف سے نبی پاک ﷺ کے حضور فریاد رقم کی ہے۔ اپنی بیٹی کی معصوم فریاد کو اُس نے شعروں میں کس خوبصورتی سے ڈھالا ہے یہ نیا تجربہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیں یا رسولؐ اللہ
مجھے بھی لاڈلی اپنی بنا لیں یا رسولؐ اللہ

....

مرا ننھا سا دل ہے اور ننھی سی یہ خواہش ہے
سنا کے لوری گودی میں سلا لیں یا رسولؐ اللہ

....

میں اپنے امی ابو جی کی پیاری نیک گڑیا ہوں
مجھے شیطان کے شر سے بچا لیں یا رسولؐ اللہ

شمس جب سیرت نگاری کو شعر کے پیکر میں

ڈھالتے ہیں تو اُن کی مشاہداتی آنکھ باطنی و ظاہری دونوں طرف سے کھلتی چلی جاتی ہے۔ پروفیسر فدا حسین ملتانی لکھتے ہیں ''شمس کے نعتیہ اشعار میں روانی اور برجستگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ الفاظ کا در و بست خاص اہتمام سے کیا گیا ہے۔ ممدوح کے مقام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہیں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ بات کو مشاہدات سے آراستہ و پیراستہ کر کے دلیل کے ساتھ سمجھانے کے کامیاب تجربات کے نمونے ان کے نعتیہ کلام میں کثرت سے میسر ہیں۔ چند اشعار دیکھیں:

ہر پھول ہر کلی کی زباں ہر درود ہے
کیسے نہ ہوں گے شمس یہ منظور دائرے

مجھے پوری اُمید ہے کہ شمس کا یہ نعتیہ کلام درِ مصطفیٰ ﷺ پر مقبولیت حاصل کرتے ہوئے ان کے لیے توشۂ آخرت بنے گا۔

سعد اللہ شاہ لکھتے ہیں کہ ''زاہد محمود شمس'' بھی اسی راہ کا راہی ہے جو سوئے مدینہ کھنچتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اُس کی سوچ یادِ مصطفیٰ ﷺ سے معطر ہے۔ وہ اپنے مقدس و معتبر خیالات کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ مدینہ اس کی نظر میں ہے اور دلِ بے تاب حضورؐ کی یاد کا مسکن۔ میں تو دعا گو ہوں کہ خدا اس کی اس نیک کاوش کو ثمر بار کرے اور اس کے سخن میں مزید نکھار پیدا کرے۔ اُس کا نعتیہ مجموعہ ''پیارے محمد ﷺ'' اوّلین نذرانہ ہے جو باریابی حاصل کرے گا تو اُسے مزید توفیق ملے گی کہ وہ اس حوالے سے یکسوئی اور طلب بڑھا دے۔ نعت اللہ کا کرم اور عطا ہے اور کیا چاہیے۔

آخر میں جناب امجد اسلام امجد کی قیمتی رائے درج کر رہا ہوں جسے پڑھ کر عام قاری بھی زاہد محمود شمس کی شعری اُٹھان اور اُڑان کو محسوس کر سکتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''مدح کا اپنے ممدوح سے جو تعلق ہوتا ہے اس کے تمام مروّجہ اصول نعت کے ضمن میں اذکار رفتہ سے دکھائی دیتے ہیں کہ محبوبِ خدا کی مدح میں انسان زیادہ سے زیادہ کہاں تک جا سکتا ہے۔ سو اب یہ معاملہ اُس دربار میں ہے جس کی فضا میں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ زاہد محمود شمس مبارک باد کے قابل ہیں کہ اُن کا نام نبیؐ کے مدح خوانوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ اپنی دعا کے دائرے کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے بجائے اُسے اُمتِ مسلمہ اور پوری انسانی برادری تک پھیلائیں کہ یہی حضورؐ کی رحمت اور شان کا تقاضا ہے۔''

شمس میری طرف سے بھی آپ کو اس خوبصورت کتاب کی اشاعت پر ڈھیروں مبارکباد اور دعائیں۔

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

مل جائے جسے روشنی اس ماہِ عرب سے
کاش ایسی کوئی نعت کروں پیش ادب سے
منظر کوئی ان آنکھوں کو اچھا نہیں لگتا
دیکھ آیا ہوں طیبہ کے در و بام کو جب سے
اُس شخص نے دنیا میں کمایا نہیں کچھ بھی
رکھتا ہی نہیں عشق جو اُس اُمّی لقب سے
تسکین کا باعث ہے مجھے اسمِ محمدؐ
آنکھوں سے لگاتا ہوں کبھی نام یہ لب سے
حاصل ہے مجھے فخر کہ اُس در کا گدا ہوں
کیا لینا ہے دنیا میں مجھے نام و نسب سے
آقا ہی سے نسبت کا یہ فیضان کہ جس نے
محفوظ رکھا مجھ کو زمانے کے غضب سے
اے شہرِ نبی میرا ٹھکانہ یہی بن جائے
لے آئی ہے تقدیر یہاں مجھ کو سبب سے
بنتے ہیں وہی نعت کی تخلیق کا حصہ
واقف ہیں جو الفاظ رضاؔ حدِّ ادب سے

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

امکان سے باہر ہے ادراک سے بالا ہے
بے مثل زمانے میں حسنِ شہِ والا ہے
مدحت کا ہنر مجھ کو آقاؐ نے عطا کر کے
رستہ مری بخشش کا کیا خوب نکالا ہے
کس منصبِ اعلیٰ پر فیض ہے وہ دنیا میں
محبوبِ دو عالم کا جو چاہنے والا ہے
جس دن سے رقم میں نے توصیفِ پیمبر کی
سوچوں پہ مرے تب سے اک نور کا ہالہ ہے
اُس گنبدِ خضریٰ کا پرتو ہی تو ہے جس سے
دنیا میں ہر جانب خوشبو ہے اُجالا ہے
کب اُس درِ اقدس سے مایوس کوئی لوٹا
کب مانگنے والے کو سرکار نے ٹالا ہے
ہر روپ انوکھا ہے آقاؐ کی محبت کا
سرکارؐ کی چاہت کا ہر رنگ نرالا ہے
جز اس کے کوئی بھی میں پہچان نہیں رکھتا
سرکار کی مدحت ہی اک میرا حوالہ ہے
اوصاف لکھوں کیسے اس قریہ اطہر کے
ہر نقش مدینے کا رشکِ گل و لالہ ہے

علی رضا / لاہور

اڈھا پہلوان

مظہر کلیار/لاہور

مظہر کلیار یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور میں اُردو زبان وادب میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اُن کے ایم فل کے مقالہ کا عنوان ''عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' ہے۔ جسے اُردو ادب کے اساتذہ اور طالب علموں میں کافی سراہا گیا۔ اُن کی ادبی تحریریں وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' میں عطاء الحق قاسمی کے مزاحیہ کرداروں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ کے عنوان سے ان کی تحریروں پر مشتمل سلسلہ شروع کیا جارہا ہے اُمید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔

''روزنِ دیوار سے'' میں پیش کیا جانے والا یہ مزاحیہ کردار اپنے اندر گہری سنجیدگی سموئے ہوئے ہے۔ یہ کردار عطاء الحق قاسمی کے گہرے مشاہدے پر مبنی کردار لگتا ہے۔ انداز و اطوار کے ساتھ ساتھ نام اور کلام سے بھی ''ادھا پہلوان'' اپنی مزاحیہ شان بیان کرتا دکھائی دیتا ہے ہمارا معاشرہ اڈھوں کا معاشرہ ہے۔ اور ہم مکمل شکل وصورت کے ساتھ پورے نہیں بلکہ اڈھے اور ادھورے ہیں:

ہمارے ادھورے پن کی کہانی بچپن سے شروع ہوتی ہے اور ہم مرتے دم تک ادھورے رہتے ہیں۔ ہم خود ادھوری کہانیاں ہیں اور سنتے بھی ادھوری کہانیاں ہیں۔ اور موقعہ ملنے پر جب کوئی کہانی سناتے بھی ہیں تو وہ بھی ادھوری گویا ادھورے پن کا ایک چکر ہے۔ جس نے پورے معاشرے کو ادھورے چکر میں ڈال رکھا ہے!

''گو ہم فلم دیکھنے کے بھی خاصے شوقین ہیں۔ مگر فلم خصوصاً انگریزی فلموں کی ''اشٹوری'' سننے کا تو ہمیں جنون ہے۔ مگر اسی صورت میں اگر یہ ''اشٹوری سنانے والا ہمارا یار ''اڈھا پہلوان'' (ٹھنڈی کھوئی والا) ہو۔ اڈھا پہلوان کو بچپن میں اس کے باپ نے ''اعلیٰ تعلیم'' کے لیے کارپوریشن سکول میں داخل کرادیا تھا۔ لیکن یہاں اسے اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگتا محسوس ہوا۔ اور وہ اکثر سکول سے غائب رہنے لگا۔ ادھر اس کا باپ محسوس کررہا تھا۔ کہ دکان پر بیٹے کی عدم موجودگی کی وجہ سے کڑھائیوں کو زنگ لگ رہا ہے۔ لہٰذا اس نے اڈھے کو دوبارہ دکان پر بٹھا دیا۔ چنانچہ وہ اس روز سے آدھا وقت کڑاہیاں مانجھنے میں صرف کرتا ہے۔ اور آدھا وقت احباب کو کسی تازہ دیکھی ہوئی انگریزی فلم کی ''اشٹوری'' سنانے میں مشغول رہتا ہے۔''

عطاء الحق قاسمی نے اپنے تخلیق کردہ کردار کا تعارف، اس کے مزاج اور مشاغل کو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کر دیا ہے۔ ادھے پہلوان کے ادھورے پن کی کہانی، اس کے اعمال و اطوار سے واضح کردی ہے۔ عطاء نے اڈھے پہلوان کے کردار کی جو عکاسی کی ہے۔ اسے پڑھ کر لگتا ہے کہ ہم خود اڈھے ہیں اور ادھوروں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ ہماری زبان وبیان میں ادھورا پن ہے۔

''اڈھے پہلوان'' کے باپ نے اڈھے پہلوان کو اپنی ادھوری خواہشات کی تکمیل کے لیے۔ سکول میں داخل کروایا اس کا خواب اسے پورا دیکھنا تھا۔ اپنے ادھورے پن کو دور کرنا تھا۔ اڈھے کی صورت میں مکمل ہونا تھا لیکن ادھا پھر ''ادھوری حرکتیں'' دہرانے لگا اور پھر اسی ''دائرے'' میں لوٹ آیا جہاں اس جیسے کئی اڈھے اُس کا انتظار کررہے تھے اس کی ادھوری کہانیاں سننے کے لیے۔

اڈھے پہلوان کی کہانی خود فریبی کی داستاں ہے۔ ہم معاشرے میں رہ کر آدھی کہانی سننے کے عادی ہوگئے ہیں اور پھر اسی ''ادھوری کہانی'' کو ''پورا'' سمجھ کر ''اندر واندر'' اس پر اتفاق کے عادی بھی ہوگئے ہیں۔

ہمارے سیاستدان ہر دفعہ ادھوری کہانیاں سنا کر، ادھوری خبریں دے کہ ہمیں ''اڈھے'' بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ''سب اچھا ہے'' کی آڑ میں بے خبر رکھ کر، ادھے پہلوان کے احباب کی طرح ہمیں خود فریبی کے سحر میں جکڑ کر چلے جاتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ، چھوٹی چھوٹی ٹولیوں پر مشتمل ''اڈھا نگری'' ہے۔ جس کو کوئی نہ کوئی اڈھا پہلوان ''ادھوری کہانی'' سنائے جارہا ہے۔ یہ ادھا پہلوان، کوئی عام شخص بھی ہے اور خاص بھی، چالاک بھی اور معصوم بھی، اور سننے والے، خود فریبی کے سحر میں جکڑے'' صدیوں سے، نسل در نسل، اس کہانی کا حصہ بنے آرہے ہیں۔

عطاء اڈھے کے کردار کی آڑ میں ہمارے اس معاشرتی کردار کو ہدف بناتے ہیں جو ہم حقائق کو چھپانے میں ادا کررہے ہیں:

''اڈھے پہلوان سے ایسی ''اڈی پچڈی'' کہانیاں سن سن کر ہم بھی اس کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اب یہ عالم ہے کہ کوئی دوست کسی فلم ہی کی نہیں، کسی جلسے جلوس کی کہانی بھی ہمیں سنانے کے لیے کہتا ہے۔ تو ہم اسے اسی طرح کی ''اڈی پچڈی'' کہانی سناتے ہیں۔''(۷)

یہ سچ ہے کہ ہم حقائق کو چھپاتے ہیں۔ معاشرے میں جھوٹ کو پروان چڑھانے میں ہم برابر

کے شریک ہیں۔ ہم آدھی کہانی سننے اور سنانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم حقیقتوں اور سچائیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں غرض ہے تو ''کہانی'' سے، یہاں ہر طرف کہانیاں ہی کہانیاں ہیں۔ مگر سچائی سے عاری کہانیاں ان میں رنگِ بیاں تو ہے۔ لیکن سچائی کا عنصر نہیں۔ ہماری سوچ محدود ہوگئی ہے۔ ہم ''اک خاص'' دائرے میں جی رہے ہیں۔ ہمارا دن اخبار کی ادھوری کہانیوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر پورا وقت ہم ''ادھے پہلوانوں'' کی کہانیاں سن سن کر گزار دیتے ہیں۔

ادھے پہلوان کا کردار ہمارے معاشرے میں جا بہ جا موجود ہے۔ یہ کردار اک پوری کہانی ہے جو کہ ادھے پہلوان کی زبانی ہے۔ یہ کردار ہمارے معاشرے کے لاکھوں افراد کا نمائندہ ہے، ترجمان ہے، اور ایک حقیقت کا نام ہے۔

یہاں کتنے لوگ ہیں جن کی زندگیاں اک خاص دائرے میں بسر ہو جاتی ہیں جو پیدا ہوتے ہی زمانے کی ''کڑاہائیاں مانجھنے'' کے لیے ہیں۔ یہ لوگ خود کہانی ہوتے ہیں، کہانیاں سنتے ہیں اور سناتے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ان کی نظر میں ملکی اور غیر ملکی معاملات کہانی ہوتے، یہ ہنگاموں میں پیدا ہوتے ہیں اور ہنگامے ان کی کہانیوں کا حصہ ہوتے ہیں:

''ہم جو آدھی کہانی سناتے ہیں اور وہ جو پوری کہانی سننا چاہتے ہیں۔ سب ادھے پہلوان ہیں، ہماری ادھی عمر کڑاہائیاں مانجھتے گزر گئی ہے باقی بھی گزر جائے گی۔''

یہ ایک المیہ ہے۔ انسانیت کا، اک دردناک کہانی ہے۔ جس میں ہمارا کردار بھی کہیں نہ کہیں ''ادھے پہلوان'' جیسا ہے۔ ہماری زندگی کی کتاب میں محرومیوں اور حسرتوں کے باب میں ہمیں جا بہ جا ''ادھے پہلوان'' کے کردار میں نظر آتے ہیں۔ ادھا پہلوان ایک ایسا کردار ہے۔ جو جانے انجانے میں ایسی بات بھی کر جاتا ہے جو پوری کہانی ہوتی ہے۔ ادھے پہلوان کی ''پوری بات'' میں کبھی کبھی ''پوری سچائی'' نظر آتی ہے:

''تو پھر بتاؤ وائیں صاحب اپنے قول کے پکے ثابت ہوں گے یا نہیں؟ آپ کی باتوں سے تو لگتا ہے۔ کہ یہ مشکل کام ہے۔ ویسے چھوٹے کا بھی یہی خیال ہے۔ چھوٹے کو تو جانتے ہیں نا آپ؟''

''ہاں وہ جو تمہاری دکان پر کڑاہائیاں مانجھتا ہے۔''

''جی جی وہی، وہ کہا کرتا ہے کہ جس کام میں چھوٹوں کا فائدہ ہو وہ کام ''بڑے نہیں ہونے دیتے۔''

یہاں کے ''بڑے'' چھوٹوں کو ہمیشہ چھوٹا رکھ کر خود بڑا رہنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ''چھوٹا'' بھی سمجھتا ہے لیکن اس کے ''ازلی چھوٹے پن'' کا ''طوق'' اسے کبھی کسی بڑے کے برابر کھڑا نہیں رہنے دیتا۔

اک طبقہ نام نہاد ''اشرافیہ'' کا ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبے میں کسی کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں دیتا۔ یہ بڑے ادب، سماج، سیاست، ثقافت اور مذہب کے اپنے تئیں گرو ہیں۔ اور یہ اپنے اعمال وعقائد کے معاملے میں ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کے مصداق کسی چھوٹے کو ''بڑا'' ہونے کا موقع نہیں دیتے۔

ادھا پہلوان کا کردار معاشرے کی تلخیوں کو، بڑے تلخ انداز میں ہمارے سامنے لاتا ہے ''ادھے پہلوان'' (ٹھنڈی کھوئی والے) کی باتیں'' کبھی کبھی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں:

''آپ ابھی سامنے پی سی او سے صدر بش کو فون کریں......

میں نے پوچھا کیا بات کروں؟

ادھے پہلوان نے کہا بس یہی کہ پاکستان میں کچھ ''گہما گہمی'' ہونا چاہیے اگر اس نے کہا کہ ابھی امریکہ کو اس ''گہما گہمی'' کی ضرورت نہیں تو پھر؟''

یہ سن کر ادھا پہلوان سر کھجانے لگا، پھر آہستہ سے بولا، اس صورت میں بُش سے کہیں کہ جب تک گہما گہمی شروع نہیں ہوتی۔ وہ مجھ سمیت ان سب ''ادھے پہلوانوں'' کو امریکہ بلوا لے جو زندگی میں پورے پہلوان نہیں بن سکے۔ اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی سب ''ادھے پہلوانوں'' کی اسی ملک میں قدر افزائی کا کوئی معقول انتظام کرے۔ اور یہ مطالبہ ہم بُش ہی سے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے تمام ادھے پہلوان ایسے مواقع پر ہمیشہ اُسی کی طرف دیکھتے ہیں۔ (۱۰)

ادھے پہلوان کی باتوں میں چھپا حقیقتوں کا اظہار، عطاء الحق قاسمی کی مزاحیہ کردار نگاری میں ''حقیقت نگاری'' کا واضح ثبوت ہے۔

ملک کے کتنے ادھے پہلوان الیکشن کو صرف گہما گہمی کا موجب سمجھتے ہیں ان کی نظر میں الیکشن ''دھوکہ دہی'' کا ایک تہوار ہے۔ جو ہر دو یا تین سال بعد منایا جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی کچھ نئی طاقتیں اس تہوار کی تاریخوں کو مؤخر کیے رکھتی ہیں اور یہ ایک دو، تین یا پانچ سال کی بجائے کئی دہائیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔

ادھے پہلوانوں کی نظر میں ''امریکہ بہادر'' ان گہما گہمیوں کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ ہماری سیاسی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ہمارے نااہل سیاستدانوں کو اپنی مرضی کے مطابق ''استعمال'' کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اک خاص طبقہ ''بڑوں'' کے روپ میں ہمارے نظامِ سیاست پر چھایا رہتا ہے۔ اور ہم ''ادھے پہلوان'' بنے ساری عمر پوری کہانی سنے اور سمجھے بغیر ''کڑاہائیاں مانجھتے'' گزار دیتے ہیں۔

بلّھا کیہ جاناں میں کون

رئیس عباس زیدی/لاہور

ابوالنبیاء امام الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ابتدائی حصہ میسوپوٹیمیا یعنی دجلہ اور فرات کی وادی میں گزرا۔ یہاں کچھ عرصہ پہلے طوفان نوح ہو کر گزرا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اس وادی میں کھدائی کے دوران حساب لگایا کہ پانی یا اُس سیلاب بلا کی بلندی چھبیس فٹ تھی۔ اسی کھدائی کے دوران نمرود کے محل کے گیٹ بھی برآمد ہوئے جن کے ستونوں پر سینگوں والے بیل بنے ہوئے تھے۔ یہیں کہیں آتش نمرود میں عشق بے خطر کود پڑا ہوگا اور قران کے الفاظ میں اس آگ کو ''سلامتی'' بنا دیا گیا ہوگا اور عقل بیچاری محو لب بام حیرت سے تکتی رہ گئی ہوگی۔ یہیں بتانِ آذر توڑے گئے ہوں گے۔ یہیں حضرت بی بی سارہؓ اور حضرت بی بی ہاجرہؓ کے ہاں اسماعیلؑ و اسحاقؑ پیدا ہوئے۔

آلِ اسماعیلؑ اور آلِ اسحاقؑ:

''اے گھر والو! تم پر خدا کی خاص رحمتیں ہیں۔ جو تم سے محبت کرے گا میں اُن سے محبت کروں گا۔''

حکم ہوا کہ بی بی ہاجرہؑ اور شیر خوار اسماعیلعلیہ السلام کو وادیِ مکہ میں چھوڑ کر کنعان کی طرف ہجرت کر جاؤ۔

بی بی ہاجرہؑ نے پوچھا ''ہمیں اس ویرانے میں کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہو؟''

فرمایا ''اللہ کے''

پیاسے اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں بی بی صفا اور مروہ کے درمیان اضطراری کیفیت میں بھاگ رہی تھی۔ پہاڑی کے پیچھے سے گزرتے ہوئے جب حضرت اسماعیلؑ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو بی بی اور تیز بھاگتی۔ بی بی کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اس قدر بھائی کہ قیامت تک مسلمانوں کے لیے حج اور عمرہ کرنے والوں کے لیے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو واجب قرار دے دیا۔ ننھے پیغمبر نے پیاس سے ایڑیاں رگڑیں تو ایک میٹھے پانی کا چشمہ رواں ہو گیا۔

بی بی ہاجرہؑ نے آ کر دیکھا تو کہا ''زم زم'' رُک جا۔

اور یہ چشمہ آج تک رواں ہے۔ پھر حضرت ابراہیم کنعان سے بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ سے ملنے واپس آئے۔

''بیٹا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں''

اس بارہ سال کے بیٹے نے کہا ''آپ خدا کے حکم کی تعمیل کیجیے آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔''

اور پھر ''فدینا بہ ذبیحٍ عظیم'' ہم نے اسے آنے والی ذبیحِ عظیم کا فدیہ قرار دیا اور اقبال نے کہا:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

دین ابراہیمیؑ پر قائم اولاد اسماعیلؑ یہاں پروان چڑھتی رہی۔ حضرت ہاشمؑ کے پاس خانہ کعبہ کی کنجیاں تھیں۔ حج پر بہت بڑا میلہ بھی لگتا۔ حضرت ہاشم حج کے موقع پر کھانے کا سامان جمع کر لیتے اور پھر قحط کے زمانے میں لوگوں میں روٹیاں تقسیم کرتے۔ پھر شام کے ساتھ تجارت ہونے لگی۔ بہت خوشحالی آ گئی۔ پرانا قبائلی نظام نئے سرمایہ دارانہ رویوں سے ڈگمگاتا ہوا نظر آنے لگا۔

جزیرہ نما عرب کی سرحدوں پر یہودی بستیاں اور سرحد سے پرے بازنطینی ایمپائر ہے۔ بازنطینی رومیوں اور ایرانی آتش پرست سلطنت میں ٹھنی رہتی ہے۔ یہ اُس وقت کی سپر پاورز ہیں۔ بنو ہاشم کے کزن بنو اُمیہ امیر تاجر ہیں۔ اب حضرت عبدالمطلبؑ کا زمانہ آن پہنچا ہے۔ ابراہیم کا لشکر خانہ کعبہ، حج پر یہاں تجارتی سرگرمیوں اور اُس کی مرکزی حیثیت کو مٹانا چاہتا ہے۔ اس لشکر نے حضرت عبدالمطلبؑ کے کچھ اُونٹ بھی پکڑ لیے۔ آپ اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کرنے پہنچے۔ کہا گیا کہ آپ کو اپنے اُونٹوں کی پڑی ہے۔ ہم تو معاذ اللہ خانہ کعبہ کو ڈھانے آئے ہیں۔ حضرت عبدالمطلبؑ کے ایمان کا یہ عالم ہے کہ فرمایا کہ اُونٹ میرے ہیں واپس کر دو۔ گھر خدا کا ہے خود حفاظت کرے گا اور پھر ترمیھم بحجارۃ من سجیل۔ فجعلھم کعصف ماکول۔ ''ہم نے انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔''

حضرت عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔ جنابِ رسول خداؐ کی پرورش کی ذمہ داری پہلے حضرت عبدالمطلبؑ پر تھی۔ پھر یہ فریضہ حضرت ابوطالبؑ نے نبھایا اور خوب نبھایا۔ عرب کے دستور کے مطابق کھلی فضا میں پرورش کے لیے مائی حلیمہ کے حوالے کیے گئے۔ مکہ مکرمہ سے جدہ جانے والی پرانی سڑک پر اب بھی وہ گاؤں موجود ہے جس کا نام حدہ ہے۔ راقم الحروف نے اتفاقاً یہ گاؤں دیکھ لیا۔ اس کی خاک کو آنکھوں سے لگایا۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے اور بجا طور پر فخر کیا کرتے تھے کہ

''لوگو! میرا تعلق بنو ہاشم سے ہے اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے۔''

یاد رہے کہ بنو سعد حضرت مائی حلیمہ کا قبیلہ تھا۔ حضرت ابوطالبؑ اپنے پیارے بھتیجے کو اپنے ساتھ سفر پر شام بھی لے جاتے۔

حضرت ابوطالبؑ نے تجارت کی غرض سے ایک کارپوریشن بھی بنائی تھی جس کا نام ''لئیلاف قریش'' رکھا تھا۔ یہ بہادر، با اثر اور باعزت سردار اپنے اس پیغمبر بھتیجے سے عشق کی حد تک محبت کرتے تھے۔

بارش عرصے سے نہیں ہوئی۔ قحط سالی کا دور ہے۔ اہل مکہ خانہ کعبہ کے پاس بارش کی دُعا کے لیے جمع ہیں۔ اتنے میں حضرت ابوطالب حضور نبیؐ پاک جن کا دس بارہ سال کا سن ہے، کی اُنگلی تھامے وہاں پہنچ جاتے ہیں اور اپنا یہ خوبصورت شعر پڑھتے ہیں:

لوگو! ایسے بارش نہیں ہوگی

اس چاند جیسے چہرے والے بچے کا واسطہ دے کر مانگو

اور پھر اتنی بارش ہوئی ہے کہ جل تھل ہو گیا۔

پچیس برس کی عمر میں ایک اور محسن اسلام شخصیت حضورؐ کی زندگی میں آتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؓ کا حق مسلمانوں سے ادا نہیں ہوا۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں تمام سرمایہ حضرت خدیجہؓ کا خرچ ہوا۔ رسولِ خدا جب کبھی اُداس ہوتے تو بی بی خدیجہؓ فرماتیں فلاں سردار ایمان نہیں لایا۔ اُس نے میرے اتنے ہزار دینار قرض دینے ہیں۔ میں اُس کا قرض معاف کر دوں گی اور تو اور رسولِ پاک ہجرت فرما گئے۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی زمین کا سودا ہو گیا۔ حضرت علیؑ لوگوں کی امانتیں لوٹا کر گھر والوں کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچے۔

حضور نبی کریمؐ نے پوچھا ''فاطمہ! کچھ رقم ہے؟''

آپ نے فرمایا ''اماں نے مرتے وقت وصیت کی تھی اور یہ رقم دے کر کہا تھا کہ اس کی آنحضورؐ کو ایک وقت اشد ضرورت پڑے گی''

اور یوں مسجد نبوی کے لیے زمین بھی جنابِ خدیجۃ الکبریٰؓ کے سرمائے سے خریدی گئی۔

آیئے ذکر کریں جنابِ علی مرتضیٰؑ کا کہ اقبال کہتے ہیں:

مسلم اول شہ مرداں علیؑ

عشق را سرمایہ ایماں علیؑ

اسلام میں دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے

اِک ضرب یداللّٰہی اِک سجدہ شبیری

کہیں سرمایہ محراب و منبر
کہیں مولا علیؑ خیبر شکن عشق

آیئے ذکر کریں اس جگر گوشہ رسولؐ کا جسے آتے دیکھ کر رسولِ خداؐ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ آپ بی بی فاطمہؑ سے مخاطب ہوتے تو فرماتے ''فاطمہ! میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔''

اقبالؔ بی بی فاطمہؑ کی تعریف کرتے ہیں:

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز

از سہ نسبت حضرتِ زہرہؑ عزیز

نورِ چشم رحمت اللعالمینؐ

آں امام اولیں و آخریں

بانوئے آں تاجدار حل اُتا

مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا

مادرِ آں مرکزِ پرکار عشق

مادرِ آں قافلہ سالارِ عشق

پاس فرمانِ جناب مصطفیٰؐ است

ورنہ گرد تربتش گردیدمے

سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

۱۱ ہجری حضرت نبی پاکؐ کا وصال ہوا اور ٹھیک ۵۰ سال بعد ۱۰ محرم ۶۱ ہجری کو واقعہ کربلا برپا ہو گیا۔ آیئے! حضرت معین الدین چشتی اجمیری کا

سہارا لیں۔ حضرت معین الدین چشتی جن کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے امام حسینؑ کے واسطے سے مولا علیؑ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی جانب سے جناب حسن مثنیٰ سے ہوتا ہوا امام حسنؑ اور حضرت علیؑ سے جا ملتا ہے۔ اپنے مرشد حضرت عثمان ہارونی کی ہدایت پر جہانِ کفر ہندوستان میں اسلام کی روشنی پھیلانے اجمیر شریف لائے۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

شاعر مشرق نے یہاں بھی سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
بحرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است
بس بنائے لا الہ گردیدہ است

امام زین العابدینؑ سیّد سجادؑ کی عمر فقط تیئس سال ہے کربلا کے بعد کا بوجھ یا تو اس بیمار نوجوان کے کندھوں پر ہے یا جناب زینبؑ کے جو کردار اور گفتار میں حضرت علیؑ کی بیٹی ہیں۔

حدیثِ عشق دو باب است کربلا و دمشق
یکے حسینؑ رقم کرد و دیگرے زینبؑ

سیّد سجادؑ اور بی بی زینبؑ کے خطبے دربار کوفہ، مسجد دمشق اور دربار یزید میں تاریخ کے فیصلہ ساز خطبے ہیں۔ جو اہل تشکیک کی ہمتیں قیامت تک درست کرتے رہیں گے۔

زندانِ شام سے رہائی کے بعد سیّد سجادؑ واپس مدینے پہنچے۔ بنی اُمیہ کا دورِ خلافت شروع ہو چکا ہے۔ زیدؑ شہید جنہیں زید الورد یعنی گلاب سے چہرے والا زید کہا جاتا ہے، کو ہشام بن عبدالملک کے حکم سے شہید کیا گیا۔ لاش کھجور کے درخت پر لٹکا دی گئی۔ پرندوں نے پسلیوں میں گھونسلے بنا لیے تھے۔ اس پر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لاش جلا کر راکھ دجلہ میں بہا دی گئی۔ چند جانثار سترہ سالہ یحییٰ بن زید کو خراسان لے گئے جہاں انہوں نے ایک خراسانی خاتون سے شادی کر لی اور ایک بچے کے باپ بھی بن گئے۔ خراسان ہمیشہ سے سادات کی پناہ گاہ رہا ہے۔ شاہ پرست ایرانی ہمیں اپنے شہزادی شہر بانو کی اولاد سمجھتے تھے۔ جناب شہر بانو نوشیرواں عادل کی پوتی اور یزدگرد کی بیٹی ہیں۔ قادسیہ کی جنگ میں ایران فتح ہوا۔ قیدی بنا کر لائی گئیں اور حضرت امام حسینؑ سے نکاح ہوا۔ ذکر ہو رہا تھا یحییٰ بن زید کا۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ایک اور معرکہ ہوا۔ فتح نصیب ہوئی لیکن اُس کے بعد جد امجد حضرت یحییٰ بن زید جن کی عمر ۱۷ یا ۱۸ سال ہو گی کو بنی اُمیہ کے جاسوسوں نے سربازار ذبح کر دیا۔ ابومسلم خراسانی اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہے۔ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ اس خوبصورت نوجوان کو کن لوگوں نے ذبح کر ڈالا۔ پتہ چلنے پر کہ یہ اولادِ علیؑ اور بنو ہاشم ہیں اور اُس نے مزید کھوج لگایا کہ ان کا کوئی باقی بچا ہے؟ اُن دنوں امام محمد علی اور ابوالعباس حمیمہ میں بیٹھے اپنے داعی بنا رہے تھے۔ الیکشن سلوگن بنی امیہ سے واقعہ کربلا کا انتقام لینا تھا۔ یوں یہ خراسانی سردار ابومسلم خراسانی بنو عباس کا داعی بنا۔ تاریخ میں دو جرنیلوں کے بارے میں پڑھا کہ نہ تو انہیں شکست کی خبر پریشان کرتی تھی اور نہ فتح کی خبر خوشی دیتی تھی۔ ایک ابومسلم خراسانی اور دوسرے سلطان شہید ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہو گا کہ حیدر علی کا مقامِ پیدائش چنیوٹ کے قریب ایک گاؤں ہے۔

ذکر ہو رہا تھا یحییٰ بن زیدؑ کا جن کا مزار مشہد کے مشرق میں ۹۰ میل کے فاصلے پر میامی میں ہے۔ ۲۰۰۱ء میں جد امجد کے مزار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ بنو اُمیہ اور پھر بنو عباس کے زمانے میں اولادِ علیؑ در بدر ہوئی۔

طوس و مدینہ کوفہ و بغداد کربلا
بکھرے گل ریاضِ محمد کہاں کہاں

بلخ و بخارہ دور دراز مسلم نو آبادیات تھیں۔ جان بچانے کے لیے یہ دُور دراز علاقوں کا سفر کر گئے۔ تبلیغ اسلام گھٹی میں پڑی تھی۔ مخدوم جلال الدین سرخپوش بخاری اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخارا سے اُوچ شریف پہنچے۔ اُن کے پوتے شاہ ولایت نقوی امروہہ کی طرف نکل گئے۔ پنجاب اور یوپی کے نقوی البخاری انہیں کی اولاد ہیں۔

سیّد علی ہمدانؒ کشمیر پہنچ گئے۔ آج ہمدانی سادات کشمیر اور پوٹھوہار میں کثرت سے نظر آئیں گے۔ جد امجد ابوالفرح واسطی نے واسط سے جو آج کل عراق کا ایک صوبہ ہے، ایک بار پھر غزنی ہجرت کی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب محمود غزنوی ہندوستان پر حملے فرما رہے ہیں۔ البیرونی لکھتا ہے کہ "محمود

غزنوی کے حملوں سے ہندو ریت کے ذروں کی طرح بکھر گئے۔'' غزنی کی گلیاں ہندو غلاموں اور کنیزوں سے بھرتی گئیں۔ایک قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔کسی دانشمند مصاحب نے صلاح دی کہ کسی نجیب الطرفین سیّد کو دعا کے لیے ساتھ لے چلیں۔ برکت سے قلعہ فتح ہو جائے گا۔کسی سیّد صاحب کی تلاش ہوئی کسی نے بتایا کہ ایک کٹیا میں ایک بزرگ کتابیں لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔حکما کم مرگِ مفاجات۔چشم تصور دیکھتی ہے کہ آگے لشکر اور سب سے پیچھے ایک گھوڑے پر ایک بزرگ ابوالفرح واسطی سوار پیچھے ایک خچر پر کتابیں لشکر کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔راستے میں ایک منہ زور دریا آ گیا۔طوفان آیا ہوا ہے۔فوج گھوڑوں سمیت دریا عبور نہیں کر پا رہی۔کسی نے مشورہ دیا کہ سیّد صاحب کو بلوایئے۔آپ نے دریا کے کنارے مصلہ بچھایا۔دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ربّ العزت کو عزت سادات کا واسطہ دیا ہوگا۔طوفان تھم گیا اور فوج بحفاظت دریا کے پار اُتر گئی۔

ابوالفرح واسطی کے چار بیٹے تھے۔دو اُن کے ساتھ واپس غزنی چلے گئے۔دو ہندوستان میں بس گئے۔ایک کی اولاد سادات بارہہ ضلع مظفر نگر۔جن کی وجہ سے شہرت ''بادشاہ گر'' سیّد برادران، علی حسین اور عبداللہ حسین ہیں جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد کے مغلیہ دور کے دورِ ابتلا میں دہلی کا بادشاہ بنایا اور اُتارا کرتے تھے۔ ابوالفرح واسطی کے دوسرے بیٹے کی اولاد میں سے سیّد ابراہیم جو کسی طرح ''موضع بھریلی'' پہنچے یہ ایک قصبہ آج کے چنڈی گڑھ سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اُس وقت وہاں راجہ بھیروں پال کی حکومت تھی۔سیّد ابراہیم کے عربی گھوڑوں کو دیکھ کر راجہ للچا گیا۔اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ رات کو اُن کے پڑاؤ سے یہ گھوڑے کھول لاؤ۔روایت کے مطابق انہوں نے گھوڑے تو کھول لیے مگر اندھے ہو کر وہیں بیٹھے رہے۔سیّد ابراہیم صبح نماز فجر کے لیے اُٹھے تو کچھ آدمیوں کو بیٹھے ہوئے پایا۔احوال پوچھنے پر وضو کے پانی کے چھینٹے دیے۔راجہ اپنے آدمیوں سے یہ ماجرہ سننے کے بعد خدمت میں حاضر ہوا۔وہیں رہ جانے کی پیش کش کی اور یوں سیّد ابوالفرح واسطی کے یہ اولاد ''زیدی الواسطی'' کی نسبت سے موضع بھریلی ضلع انبالہ تحصیل کھرڑ میں آباد ہوئی کہ آج بھی سنٹرل ریونیو ریکارڈ بورڈ آف ریونیو لاہور کے ریکارڈ کے مطابق شجرہ نسب میں یہی درج ہے۔

دادا ابو علی بخش پڑھے لکھے بزرگ تھے۔اُن کے کتب کے بے شمار قلمی نسخے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں بھریلی رہ گئے۔مجالس پڑھنے لکھنو اور حیدر آباد دکن جایا کرتے تھے۔دادا غلام عباس اُن کے واحد نرینہ اولاد تھے۔جب گاؤں میں قحط پڑتا تو گندم کا آٹا پسوا کر بوریاں خود اُٹھا کر بیواؤں اور یتیموں کے گھر چھوڑ کر آیا کرتے تھے۔اُن کے اکلوتے بیٹے علی اکبر نے اپنے والد سے ۱۲۰۲ ایکڑ زمین بمطابق ریونیو ریکارڈ موضع بھریلی وراثت میں حاصل کی۔

بھریلی کا سکھ سردار سیّدوں کی اکثریت سے خوفزدہ تھا۔دوسری جنگ عظیم سے واپس آئے ہوئے کچھ سیّد فوجی صبح کو چند بارہ بور کی بندوقوں کے ساتھ پریڈ بھی کیا کرتے تھے۔اُس نے ستمبر ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ پٹیالہ کو خط لکھا کہ اُسے سیّدوں سے جان کا خطرہ ہے۔لہٰذا ریاست پٹیالہ کی فوج سے بھرے ہوئے دو ٹرک اور پیچھے ہزاروں بلوائی بھریلی پہنچ گئے۔موضع بھریلی جو خطہ یونان تھا۔ہل چلاتے ہوئے سیّد صاحبان میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کے سینکڑوں زبانی یاد بند پڑھ جاتے۔ یہ موضع تباہ ہوا۔مردوں کی اکثریت شہید ہوگئی اور لٹے پٹے ایک بار پھر مہاجر ہو کر پاکستان آنے کے لیے انبالہ کیمپ پہنچے۔برادر محترم جو کہ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلاسفی فرسٹ کلاس فرسٹ کر چکے تھے۔بروالہ کیمپ سے بھریلی رات کو اپنی کتابیں لینے بھریلی گھر پہنچے۔بلوائیوں نے گھر کا صحن تک چھپے خزانوں کی تلاش میں کھود رکھا تھا۔ واپسی پر سکھ بلوائیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر کھیتوں میں گر گئے اور گھر والوں سے بچھڑ گئے۔اہل خانہ انہیں رو دھو بیٹھے تھے۔آگ اور خون کا دریا پار کر کے یہ خاندان جب والٹن مہاجر کیمپ پہنچا تو اپنے اُسی بیٹے کو کیمپ کمانڈنٹ پایا۔

بعد ازاں موصوف پرنسپل گورنمنٹ کالج ریٹائر ہوئے۔

☆☆☆

جاپان کا پرائمری نظامِ تعلیم

عامر بن علی/ جاپان

تھا ندیار خان سے میری کوئی زیادہ دوستی نہیں ہے۔ ہمارا کاروبار کیونکہ ایک ہی نوعیت کا ہے، اس لیے اکثر ملاقات ہوجاتی ہے۔ پچھلے سال فاٹا کے حالات سے تنگ آ کر، جہاں ایک طرف ڈرون طیارے بمباری کرتے ہیں اور دوسری طرف طالبان نامہربان ہیں، اپنے بیوی بچوں کو وہ جاپان لے آیا۔ اس کے چار بچوں کا داخلہ میرے شوروم سے ملحقہ سرکاری پرائمری سکول میں ہوا ہے۔ اب کبھی کبھی سکول سے چھٹی کے وقت وہ بچوں کو لینے کے لیے آتا ہے تو پہلے میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جب بچوں کو لینے کے لیے سکول جاتا ہے تو اپنی گاڑی میرے شوروم پر ہی چھوڑ جاتا ہے۔ میں یہ بات شاید نوٹ نہ کرتا مگر میرے ایک اور پاکستانی دوست بھی یہی عمل کیا کرتے تھے۔ ملک صاحب نے اب تو اپنی فیملی پاکستان شفٹ کردی ہے، مگر جب ان کی بچی اس سکول میں پڑھتی تھی تو وہ بھی جب اسے لینے کے لیے آتے تو اپنی گاڑی میرے پاس کھڑی کر جاتے تھے۔ بچی کو سکول سے لے کر آتے اور پھر یہاں سے اپنے گھر یا دفتر کا رخ کیا کرتے تھے۔ عقدہ یہ کھلا کہ پرائمری سکول میں بچوں کے والدین انھیں گاڑی میں لے کر آ یا پھر واپس لے جا نہیں سکتے۔ ذاتی سواری پر بچوں کی آمدورفت پر پابندی ہے۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ والدین اپنے بچوں کے لیے مرضی کا سکول بھی منتخب نہیں کر سکتے۔ بچے کی رہائش گاہ کے قریب ترین سکول کا انتخاب بلدیہ کرتی ہے۔ جب بچہ چھ سال کا ہوجائے تو بذریعہ ڈاک بلدیہ کی طرف سے والدین کو اطلاع ملتی ہے کہ اپنا بچہ فلاں سکول میں فوراً داخل کروائیں۔ بلدیہ کی طرف سے ملنے والی اس اطلاع کو حکم نامہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ نو سال تک تعلیم حاصل کرنا قانوناً لازم ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں آئینی سزا مقرر ہے۔ مگر اس حکم کی خلاف ورزی ہوتی نہیں کیونکہ جاپان میں شرح خواندگی عملاً صد فیصد ہے۔ جب میں نے آج تک یہاں ایک بھی شخص ایسا نہیں دیکھا جسے پڑھنا، لکھنا نہ آتا ہو۔ صبح آٹھ بجے گھر سے بچے پیدل سکول پہنچتے ہیں اور پھر اسی طرح سر پر پیلی ٹوپی پہنے ساڑھے تین بجے واپس اپنے قدموں پر چل کے گھر پہنچتے ہیں۔ اس پابندی کا مقصد بچوں کو جسمانی طور پر مضبوط اور صحت مند بنانا ہے۔ صبح سویرے بچے اپنی رہائش گاہ سے نکل کر ایک جگہ اکٹھے ہوجاتے ہیں اور پھر سڑک کے کنارے لائن میں پیدل چلتے ہوئے سکول کا سفر یوں طے کرتے ہیں کہ بڑی جماعتوں کے لڑکے لڑکیاں آگے آگے ہوتے ہیں اور چھوٹی جماعتوں کے بچے ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ بچوں کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا، ہر محلے میں روزانہ دو ماؤں کی ڈیوٹی لگتی ہے کہ وہ سکول جاتے ہوئے بچوں پر نظر رکھیں۔ جب تک کہ وہ اگلے محلے میں داخل نہ ہو جائیں، اگلے محلے میں بھی دو طالب علموں کی مائیں پیدل چلتے ہوئے بچوں کی راہ میں کھڑی ہوتی ہیں اور سکول تک بچے اپنی ماؤں کی نظروں میں ہی راستہ طے کرتے ہیں۔

پرائیویٹ سکول یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک فیصد سے تو یقیناً کہیں کم ہیں، جو سکول نجی شعبے میں موجود ہیں۔ وہ بھی غیر ملکیوں یا پھر کسی اور ناگزیر وجہ سے قائم ہیں۔ بہر حال پورے جاپان کے معیاری نجی سکول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ سرکاری سکولوں میں تعلیم بالکل مفت ہے۔ البتہ دوپہر کا کھانا بچوں کو سکول کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے جس کے معمولی سے اخراجات وصول کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ یہ واجبات ادا نہ کر سکتا ہو یا پھر نہ کرنا چاہے تو یہ بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ گھر سے ٹفن میں کھانا لانے پر سخت پابندی ہے۔ مسلمانوں کے بچے کیونکہ صرف حلال کھاتے ہیں۔ ان کے لیے حلال کھانا بھی سکول والے ہی مہیا کرتے ہیں۔ گھر سے لے کر نہیں آ سکتے۔ کھانا تمام بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ کمرۂ جماعت میں ہی کھاتے ہیں اور اس کے بعد آدھ گھنٹہ آرام کرتے ہیں۔ چھوٹے بچے چونکہ جلدی تھک جاتے ہیں اس لیے ان کو ہر گھنٹے کے بعد دس منٹ کی چھٹی ہوتی ہے۔ ایک بار بیس منٹ اور پھر ایک گھنٹے کی لنچ بریک جسے ہم آدھی چھٹی کہتے ہیں۔ جس میں آدھا وقت کھانے کے لیے اور آدھا آرام کے لیے اور ہاں! بچوں کو کھانا تقسیم بھی بچے ہی کرتے ہیں۔ پرائمری سکول کے بچوں کا کوئی مخصوص یونیفارم نہیں ہوتا۔ صرف پیلے رنگ کی ٹوپی ہوتی ہے۔ ہفتے میں دو دن سکول سے چھٹی ہوتی ہے، یہ تعطیل بروز ہفتہ اور اتوار ہوتی ہے۔

یہاں سکول میں بچے کے فیل ہونے کا تصور نہیں ہے۔ تمام طلباء تعلیمی سال مکمل ہونے پر، جو کہ ہماری طرح مارچ کے مہینے میں ہوتا ہے۔ اگلی کلاس میں ترقی پا جاتے ہیں۔ پرائمری سکول چھ سال کا ہوتا ہے اور مڈل تین سالہ، یہ نو سالہ تعلیم لازمی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ اگر آپ کسی بچے سے اس کی عمر پوچھیں تو جواب میں وہ اپنی سکول کی کلاس بتاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر جماعت کے تمام بچوں کا سن پیدائش یکساں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ کہہ رہا ہے کہ وہ تیسری جماعت کا طالب علم ہے تو وہ لازمی طور پر نو سال کی عمر کو پہنچا ہے۔ تمام بچوں کو اگلی جماعت میں ترقی دینے کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی بھی بچہ احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہر جماعت میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ جو کہ عموماً پچیس اور پینتیس کے درمیان ہوتی ہے۔ اساتذہ میں مرد اور خواتین معلمین کی تعداد بھی برابر ہوتی ہے۔ کلاس روم میں کمپیوٹر، ٹی وی کے علاوہ ویڈیو گیمز بھی بچوں کے لیے مہیا ہوتے ہیں۔ سکول کی ڈسپنسری میں ڈاکٹر ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ اساتذہ کا والدین سے قریبی رابطہ ہوتا ہے۔

میاں چنوں کے جس ایم سی پرائمری سکول میں میں نے تعلیم پائی وہاں کے اساتذہ بڑے شفیق اور محنتی تھے۔ طالب علموں سے ان کا رویہ اپنی اولاد جیسا تھا، اس کے باوجود ڈنڈے کا خوف ہمیشہ ہمارے سروں پر سوار رہتا تھا۔ "مار نہیں پیار" کی پالیسی کے تحت نونہالوں کو جسمانی سزاؤں کے خوف سے تو نجات مل چکی ہے، کئی مسائل مگر حل طلب ہیں۔ سردیوں میں ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھائی کرتے ہوئے ہمیں بڑی ٹھنڈ لگتی تھی۔ یقیناً اب بھی سرما میں بچوں کے لیے ٹاٹ پر بیٹھنا مشکل ہوگا۔ حکومت اگر ٹاٹ کی جگہ سرکاری سکولوں میں ڈیسک یا کرسیوں کا بندوبست کر دے تو طلباء بہتر ماحول میں پڑھائی کر سکیں گے۔ دانش سکول ایک اچھا منصوبہ ہے جسے چاروں صوبوں تک پھیلانا چاہیے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ دیگر سرکاری سکولز میں بہتری لائی جائے۔ جس میں اولین ترجیح پرائمری سکول ہوں۔ گزشتہ ایک صدی سے ہمارے سرکاری سکولوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ مسجدوں میں نمازیوں کے لیے تو ٹھنڈے پانی کے کولر عموماً موجود ہیں۔ کیونکہ اہل ایمان اپنی مدد آپ کے تحت ان کا انتظام چلاتے ہیں مگر سرکاری سکولوں میں ننھے بچوں کو ٹھنڈے پانی کی نعمت میسر نہیں۔ اپنی حکومت سے جاپان کے سکولوں کے برابر سہولیات طلب کرنا تو حقیقت پسندانہ مطالبہ نہیں مگر گرمیوں کے موسم میں معصوم طلباء کو ٹھنڈا پانی اور ان کے پنکھوں کو بجلی فراہم کرنا تو سرکار کی ذمہ داری بنتی ہے۔

افسانہ

آئینے سے گرا ہوا عکس

پشتون احمد زئی/وزیرستان

پچھلی کئی راتوں سے جب سارا شہر سو جاتا ہے تو مجھے کچھ جوان لڑکیوں کے رونے، چیخنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں

''بابا لوگ ہمارے گھر کا دروازہ توڑ کر ہم بھوک ماریوں کو روٹی کا لالچ دے کر کپڑے اُتارنے پر مجبور کر رہے ہیں، بابا آپ کہاں چلے گئے ہو۔۔۔ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔بابا۔۔۔بابا'' روتی ہوئی آوازیں ہمیشہ سے میری نیند کی رقیب رہی ہیں، میں اٹھ کر فریج سے برف اور بوتل نکالتا ہوں، اور کھڑکی کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھ کر جمال کو یاد کرنے لگ جاتا ہوں، جمال میرا دوست، جو پچھلے ہفتے میرے گھر آیا تھا اور ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر شراب پی تھی

''یار پیسے میرے لگے ہیں اور گلاس بھرنے میں کنجوسی تم کر رہے ہو۔حد ہے یار'' اس نے اپنی بوجھل آنکھوں میں میرے چہرے کا عکس تولتے ہوئے مجھے چھیڑا تھا

''مجھے اچھی طرح سے یاد ہے تم نے پینتس برس پہلے میرے ساتھ آخری بار شراب پی تھی، اب یکدم سے اتنی پیے جا رہے ہو، مانا آج تیری دوسری بیٹی کی شادی ہے خوشی کا موقعہ ہے، لیکن ایک حد سے زیادہ شراب چہرے پر ہنسی نہیں دکھا اُگانے لگتی ہے، کیوں آج خوشی کے موسم میں آنسو کاشت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟''

''ہنسی'' وہ مسکرایا تھا

''میرے جیسے چند ہزار کی تنخواہ والے کلرک کیلئے ہنسی درد کا وہ پرندہ ہے جو آنسوؤں کے موسم میں چہرے کی دیوار پر آبیٹھتا ہے۔۔۔۔میں آج دکھ کی اس کھیتی میں کھڑا ہوں جہاں سے امید کی آخری فصل بھی کٹ کر کسی اور کے آنگن کی خوشی ہوئی ہے۔'' اس نے پاس پڑی ایک اور بوتل کھولی تھی

''مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جس دن میں پیدا ہوا تھا اُس دن اُداسی نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی دکھ نے چوراہے میں کھڑے ہو کر گیت گائے تھے اور ہوا نے میرے بابا کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا ''تمھاری پھٹی پرانی جیب میں کینسر کی دواؤں کے ساتھ ایک اور لڑکے کی خوراک کا بل بھی آ گیا ہے یقین نہیں آتا تو جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لو'' اُسی وقت دائی حلیمہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا تھا ''مبارک ہو غفور میاں، بیٹا ہوا ہے'' اور بابا کی میلی جیب سے کینسر کی دوا کے پیسے دائی حلیمہ کے دوپٹے تک روتے ہوئے گئے تھے۔اس دن بابا کی محبت کو دیمک لگ گئی تھی'' وہ رک کر تھوڑی دیر بند کھڑکی کو دیکھتا رہا ''میں نے اپنا بچپن دکھ، تنہائی اور بھوک کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزارا ہے، محلے کے باقی بچے بھی مجھ جیسے غریب تھے لیکن نجانے کیا تھا کہ تنہائی مجھے راس آ گئی تھی، شائد اسلئے کہ وہ میرے انسو اپنی آنکھوں میں چھپائے رکھتی، میری کمزوریاں اپنی جیبوں میں رکھ کر مجھ سے کہتی ''دیکھا تم کمزور نہیں ہو'' اور میری نالائقی اپنے دوپٹے میں چھپا کر میری نظروں سے بچاتے ہوئے الماری کے پیچھے رکھ کر مجھ سے کہتی ''تمھاری روشن آنکھیں فلسفے کے وہ صحیفے ہیں جنکے اوراق بڑے بڑے فلسفی بھی نہیں پڑھ سکتے'' میں جواب دیتا ''یہ جو تجھے اِن بجھتی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک دکھائی دیتی ہے دراصل محبت کے انگاروں کی روشنی ہے جسکی آگ بجھ چکی ہے اور انکو بچانے کی کوشش میں میرا جسم جل رہا ہے کیونکہ دیوار کے اس پار موت کالا جوڑا پہنے اس انتظار میں ہے کہ یہ بجھے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے، مجھے موت سے ڈر لگتا ہے کیونکہ یہاں ایک چھوٹی سی بھوک مجھے رولاتی رہتی ہے کیا پتہ جہاں موت لے جائے وہاں بھوک کی پوری نسل آباد ہو؟، سنا ہے وہاں گندم کا خوشہ تک توڑنے پر پابندی ہے، میں تو گھٹ گھٹ کر مر جاونگا'' اس نے سانس لی تھی ''تم جانتے ہو، دن اور رات ہمارے گھر اجنبیوں کی طرح آتے، چولہے میں بجھی آگ سے باتیں کرتے، ماں کی بوسیدہ قمیص کی آستینیں پھاڑ دالتے، جب وہ لکڑیاں کاٹتی تو زخم اس کے پیروں سے لپٹ جاتے اور وہ ہانپتے ہوئے دمے کی بیماری سے لڑنے لگ جاتی۔۔۔انہی دنوں مجھے ایک نیا کھلونا ملا، مجھے ملیریا ہو گیا تھا یہ وہ خوبصورت کھلونا تھا جو پہلی بار مجھے گاؤں سے باہر

لے گیا۔ بابا میرا علاج کروانے مجھے شہر لے گئے ،شہر جہاں بڑی بڑی عمارتیں سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں ندی کے دونوں جانب کھڑے درخت ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے ،رنگ برنگی گاڑیاں ،تانگیں ،رکشے اور موٹر سائکلیں ہنستی اور قہقہے لگاتی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھی ،شہر کی سب سے بڑی سڑک کے کنارے میں نے گٹر میں پاؤں لٹکائے بھوک کو روتے ہوئے دیکھا تھا اس دن میں نے باوجود بخار کے پورا دن ہنستے ہوئے گزارا تھا بابا سمجھ رہے تھے کہ شائد بیماری کا اثر میرے دماغ پر ہوگیا ہے جو میں بخار میں پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہوں۔ میرا ننھا منھا کھلونا مجھے بہت دور لے آیا تھا ،ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیاں کر ہم گاؤں واپس لوٹے تو شہر میری آنکھوں میں بس چکا تھا بھوک جو روز رات ہمارے گھر کی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر مجھے نیند سے اُٹھا کر رولاتی تھی میں اسے روتے ہوئے دیکھنے کیلئے شہر جانا چاہتا تھا ،تب میں نے ایک شام جب سورج زمین کے بالکل قریب آیا اور سونے کیلئے اپنا بستر بچھانے لگا ،تو میں نے اسکے کانوں میں سرگوشی کی ''میں جانتا ہوں تم کس روگ کے مارے ہوئے ہو''

''کیسا روگ؟'' اسکی آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے

''میں جانتا ہوں صدیوں سے تم اپنی محبوبہ (تاریکی) کی تلاش میں ہو ،روز اس اُمید پر نکلتے ہو کہ شائد آج اسکا دیدار نصیب ہو ،پر دیدار نصیب ہوتا نہیں ،معلوم ہے کیوں؟ کیونکہ وہ تجھ سے شرماتی ہے تم جب اسکے سامنے آنے لگتے ہو تو وہ چہرہ چھپا لیتی ہے بالکل اس جوان لڑکی کی طرح ،جو اپنے محبوب کیلئے رومال بُن لیتی ہے ،اور پھر تہہ کر کے الماری لے سب سے نچلے خانے میں چھپا کر رکھ لیتی ہے''

''کیا تم اس سے ملے ہو؟ کیا تم نے اس سے بات کی ہے؟ کیا وہ اب بھی ویسی خوبصورت ہے جیسے تخلیق کائنات کے وقت تھی؟ میں نے تب اسے آخری بار دیکھا تھا وہ اپنی گیلی سیاہ زلفوں میں اپنی نازک اُنگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی ،وہ مجھے دیکھ کر اس نئی نئی جوان لڑکی کی طرح شرمائی تھی جسے اسکے محبوب نے بغیر کپڑوں کے اُجالے میں دیکھ لیا ہو ،کیا اب بھی شاعر محبوبہ کی گھنی زلفوں کو اسکے سیاہ بالوں سے تشبیہ دیتا ہے؟ کیا اب بھی اسکی آمد پر دل کی دھڑکن بڑھنے لگتی ہے؟ کیا اب بھی وہ تنہائی کا دل بہلاتی ہے؟ کیا اب بھی وہ اسی طرح جاگتی آنکھوں میں نیند کے قطرے ڈالتی ہے؟ کیا وہ مجھے یاد کرتی ہے؟ کیا وہ۔۔۔''

''وہ کیسے آتی ہے ،کیسے تھکے ہارے گھروں کو اپنی بانہوں میں لے کر لوریاں سناتی ہے ،کیسے سمندر کے سینے پر ہاتھ پھیرتی ہے ،کیسے پہاڑوں پر اپنی چادر پھیلاتی ہے ،کیسے عُشاق کی خفیہ ملاقاتیں کروا کر تیری جدائی کا غم بہلاتی ہے ،رات کا جب پچھلا پہر پڑتا ہے تو کیسے تیرا نام گنگناتی ہے ،کیسے تمھارے نام خط لکھ کر اسے سمندر کی ڈاک میں ڈالتی ہے ،اور کیسے سمندر ہر بار اسکا خط غلط پتے پر پہنچا دیتا ہے میں تجھے سب تفصیل سے بتاؤ نگا ،اسکے خط تجھے اور تمھارے اسے پڑھ کے سناؤ نگا ،لیکن ایک شرط ہے''

''شرط کیا ہے؟''

''تجھے تھوڑا تیز چلنا ہوگا''

''منظور ہے''

اور پھر میں سورج اور تاریکی کے بیچ ڈاکئے کا کردار ادا کرنے لگا ،ہم دونوں اپنا وعدہ نبھاتے رہے ،سورج نے جلد ہی میری زندگی کا ایک بڑا حصہ اپنی رفتار کی وجہ سے میرے لئے مختصر کر دیا تھا لیکن اسکی قیمت میرے والدین کو چکانی پڑی ،سردیوں کی ایک اُداس رات موت نے بیرونی دروزے پر دستک دی ،وہ نقاب کئے ہوئے تھی سو میں پہچان نہ سکا ،اس نے ماں اور بابا کے نام لے کر بتایا کے میں انکی پرانی دوست ہوں اور آج رات انکی مہمان ،میں اسے اندر لے آیا ،وہ خود بابا کے کمرے کی طرف چل دی اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ صبح دیر گئے جب ماں مجھے اُٹھانے نہیں آئی تو میں خود انکے کمرے کی طرف گیا ،وہ نقاب والی دروازہ کھولا چھوڑ کر جا چکی تھی ،ماں اور بابا ایک اور طرح کی نیند پہنے (اُوڑھے) بستر پر خاموش پڑے تھے۔

میرے شہر آنے کا احوال اور شادی کا قصہ کسی خشک نقاد کے تنقیدی مضمون جیسا بے مزاہ ہے ،کیونکہ غربت جن بچوں سے بچپن میں دوستی کر لیتی ہے انکے شہر کے قصے اور شادی کی باتیں بے نمک کھانے کے جیسی ہوتی ہیں۔ تم جانتے ہو جب میں نے تمھارے ساتھ آخری بار شراب پی تھی ،اس دن میں اٹھائیس کا ہوگیا تھا اور اسی

رات میری چوتھی بیٹی پیدا ہوئی تھی، اسکے بعد کی کہانی اتنی سی ہے کہ اس رات نیند بستر میں میرا انتظار کرتے کرتے سوگئی، بچیوں کی شادیوں کے وسوسوں نے بیچ بازار میرے کپڑے پھاڑ کر پھینک دئے، جہیز کی کالی چڑیل اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے میرے ساتھ رہنے لگی، کئی بار میں نے موت کو بلانے کیلئے موبائل اُٹھایا لیکن پھر اپنی چار معصوم فرشتوں کی صورتیں میرے سامنے آ کھڑی ہوجاتی، اور رونے لگ جاتی ''بابا ۔۔۔لوگ ہمارے گھر کا دروازہ توڑ کر ہم بھوک ماریوں کو روٹی کا لالچ دے کر کپڑے اُتارنے پر مجبور کر رہے ہیں، بابا آپ کہاں جا رہے ہو۔۔بابا۔۔۔ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔۔بابا۔۔۔بابا'' میں پھر فون واپس رکھ دیتا، کئی بار اس جہیز کی بھوتنی سے تنگ آ کر میں نے پولیس بلائی لیکن پولیس ہر بار مجھے ہی حوالات میں بند کر دیتی۔ میں نے ہر بدلی ہوئی حکومت کے نام خط لکھے ''میری فرشتہ صفت بچیوں کے بالوں میں سفیدی گھونسلے بنانے لگی ہے، چند دن پہلے زہرا کے بالوں میں صرف تین سفید بال تھے اب وہ بھی بچے دینے لگے ہیں، خدارا میں کمزور انسان ہوں، اس ملک کا ایک ایماندار کلرک، میں نے زندگی ملک اور معاشرے کے نام کی ہوئی ہے، بدلے میں مجھے صرف میری بچیوں کی زندگی مجھے واپس لوٹا دی جائے'' لیکن ہر بار پتہ چلتا کہ حکومت بدلی ہے حکمران تو روز اول سے وہی ہیں۔ میں نے شراب تو بہت پہلے کی چھوڑ رکھی تھی پھر چائے اور سگریٹ بھی چھوڑ دی، کبھی کبھی دل بہت مچلتا ''تین روپے کا تو سگریٹ آتا ہے بس آج ایک پی لیتے ہیں'' میں سمجھاتا ''نادان تیری چار جوان بیٹیاں گھر بیٹھی ہیں، تجھے اس خیال پہ بھی شرمندہ ہونا چاہئے'' دل بیچارہ شرمندہ ہو کر چپ ہو جاتا۔

بڑی مشکلوں سے تین لاکھ میں بڑی بیٹی زہرا کیلئے ایک رشتہ ملا، میں نے جتنی بچت کی تھی وہ بڑی بیٹی زہرا کی شادی پر اُٹھ گئی، لیکن میں نے شکر کیا کہ ایک بچی تو اپنے گھر کی ہوئی۔ دوسری بیٹی نسرین کی شادی کیلئے پیسے جمع کرتے سات سال گزر گئے، اس بیچ وہ کالی مہندی سے اپنے بالوں میں اترتی چاندنی کو منانے کی کوشش کرتی رہی، پھر جب رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ اب تو نکمے سے نکما رشتہ بھی پانچ لاکھ سے کم میں نہیں ملتا۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد پانچ لاکھ میں ایک نائی کا رشتہ ملا، جسکی حجامت کی دکان خوب چلتی تھی، جب وہ لڑکی کو دیکھنے آئے تو نجانے کہاں سے نائی کی نظر نسرین کے کانوں کے پیچھے پڑے ایک سفید بال پر پڑی، ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور اس نے نسرین کی جگہ چھوٹی نور کا ہاتھ مانگ لیا۔۔۔۔میرا خون کھول اُٹھا، نسرین روتی ہوئی بھاگ کر کمرے میں چلی گئی، غصے سے میرا جسم کانپ رہا تھا لیکن روایت کی زنجیروں نے میرے ہاتھ باندھے رکھے۔۔۔میں نے انکار کر دیا اور بڑی مشکل سے چھ لاکھ میں اسے نسرین کیلئے ہی راضی کر لیا، ایک سفید بال مجھ غریب کو ایک لاکھ مہنگا پڑا۔ تم نے کہا تھا نا کہ آج خوشی کا موقع ہے'' اسکے چہرے پر سے زندگی کا کوئی رنگ نہ تھا'' میں بچپن سے زندگی کے آئینے میں اپنا عکس ڈھونڈ رہا ہوں، آئینے میں خدا، سماج اور معاشرہ سب کچھ ہے پر میں نہیں ہوں، بتاؤ ایسا ہونا بھی کوئی ہونا ہے؟'' اداسی اسکی جوتیاں سیدھی کر رہی تھی، کہ اتنے میں ایک سیاہ برقعے والی عورت اندر آئی تھی

''یہ جمال صاحب ہیں نا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تھا

''جی''

''آپ کی شکل ان سے بہت ملتی ہے، میں تھوڑی کنفیوز ہوگئی تھی، بڑے دنوں سے مجھے یاد کر رہے تھے، لیکن میں ذرا مصروف تھی، آج اسے لینے آئی ہوں'' اس نے اپنا نازک سا ہاتھ جمال کی طرف بڑھایا تھا جمال اسکا ہاتھ پکڑ کر لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم چلیں ہوں گے کہ دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی گر گئے، میں نے دروازے کے پاس دیوار پر لگے آئینے کو اپنا گرا ہوا عکس اُٹھانے کیلئے زمین پر آتے اور ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے دیکھا تھا، جس کی کرچیاں اب بھی میری آنکھوں میں تیرتی رہتی ہے۔۔۔۔

ناروے میں مقیم نوجوان شاعر

جواد شیخ کا پہلا شعری مجموعہ

کوئی کوئی بات

شائع ہوگیا ہے

صفحات: 176 قیمت: 300

نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

ہمارے شب و روز

روبنسن سیموئیل گل/راولپنڈی

پیٹرول کے حصول کے لئے گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھ کر ایک بار تو مَیں بوکھلا گیا مگر اَب اِس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ مجھے بھی اب اِس قطار کا حصہ بننا تھا اور یہی میرے مقدر میں تھا۔ مَیں چاہتا بھی تو آٹھ نو کلومیٹر دُور اپنے گھر تک پہنچ کر واپس پیٹرول پمپ تک نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اَب گاڑی کے فیول گیج پر سوئی ریزور سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ اور خُدا نخواستہ اگر کوئی ایمرجنسی ہوتی تو مَیں رات گئے کہاں پیٹرول ڈھونڈتا پھرتا؟

گزشتہ رات جب مَیں بیچ سڑک کے اِس بڑے پیٹرول پمپ سے گزرا تو قطار اِس سے آدھی تھی جو آج میرا منہ چڑا رہی تھی۔ تاہم گزشتہ روز ایک مسئلہ درپیش تھا کہ میرے ہمراہ تمام اہلِ خانہ بھی تھے۔ چنانچہ مَیں نے مناسب نہیں جانا کہ تھکے ہارے بچوں کو اپنے ساتھ لئے پیٹرول کی قطار میں کھڑا ہو جاؤں۔ ویسے بھی کافی مقدار میں پیٹرول ٹینک میں موجود تھا جو گھر سے صدر شہر تک تین چار بار آنے جانے کے لئے وافر تھا۔

آج رات گھر کی جانب جاتے ہوئے میرے ہمراہ انکل صادق تھے۔ مَیں نے اُن سے معذرت چاہی اور کہا، ''انکل جی پیٹرول ڈلوانا ضروری ہے اگر اَب نہ ڈلوایا تو مشکل ہو جائے گی۔''

ساڑھے دس سے اُوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ اَب وہ بھی اِس ٹائم ٹیکسی لے کر کدھر کو جاتے۔ اُنہیں علم تھا کہ مَیں اُن کو اُن کے گھر تک چھوڑ دوں گا۔ لہٰذا وہ بخوشی بولے، ''کوئی بات نہیں،...... کوئی بات نہیں، آپ پیٹرول ڈلوا لیں۔''

یہ سُنتے ہی مَیں گاڑیوں کی آدھا کلومیٹر لمبی قطار میں سب سے پیچھے بڑے اطمینان سے گاڑی لئے کھڑا ہو گیا۔ سردی خاصی تھی، انکل جی کو تو مَیں نے سیٹ پیچھے کر کے آنکھ لگا لینے کا مشورہ دیا اور اُنہوں نے اِس پر فوری عمل کیا مگر یہ آرام اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے میرے مقدر میں نہ تھا۔

سردی سے بچنے کے لئے تمام کھڑکیاں بند کیں تو تھوڑی ہی دیر میں ہماری سانسوں کے باعث شیشوں پر ایسی دُھند چھائی کہ باہر کے مدہم روشنیوں میں دکھائی دینے والے مناظر بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مَیں نے اپنی جانب کا شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا تو سرد ہوا بن بلائے مہمان کی طرح گاڑی میں داخل ہونے لگی۔ اِسی اثناء میں پچھلی جانب سے یکے بعد دیگرے کئی ہارن سُنائی دیئے۔ غور کیا تو میرے آگے کھڑا رکشہ مجھ سے کئی فرلانگ آگے بڑھ چکا تھا اور ایسی صورتحال میں خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی مَن چلا اُس خالی جگہ میں اپنی گاڑی نہ ''گھسیڑ'' دے۔ چنانچہ مَیں نے گھبراہٹ کے عالم میں گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اِس جھٹکے کے باعث خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے انکل صادق کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اِس کے بعد مَیں تو سو نہ سکا کیونکہ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا گاڑی کے اندرون کو ٹھنڈا رکھتی تھی اور وقتاً فوقتاً گاڑیوں کی یہ قطار کسی موٹے تازے اور طویل سانپ کی طرح جو اپنا شکار ثابت حالت میں ہی ہڑپ کر لینے کے بعد اُسے ہضم کرتا ہے اور بمشکل ہلتا ہے، سُست روی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

اِس دوران بیگم کا بھی فون آیا، ''اَب تک آئے نہیں کیا مسئلہ ہے؟''

''بس پیٹرول کی لائن میں لگا ہوں۔ . . ابھی باری آنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔''

انکل صادق کے گھر سے بھی فون آیا اور اُنہوں بھی گرم ٹوپی کانوں سے اٹھاتے ہوئے فون سُنا اور حقیقتِ حال بیان کیا۔

اُس رات مَیں تقریباً بارہ بجے گھر پہنچا۔

گزشتہ روز مَیں نے خوشی خوشی اپنی بیگم اور بچوں کے لئے ٹوسٹر (Toaster) خریدا۔ مَیں بے حد خوش تھا کہ اَب توے پر ڈبل روٹیاں سینکنے سے میری اہلیہ کی جان چُھوٹے گی۔ مَیں نے جوش و خروش کے ساتھ رات گئے اپنے بیٹے ایشے کو بریڈ کے دو پیس ٹوسٹ کر دیئے اور ساتھ ساتھ اُسے اور اہلیہ کو ہدایات بھی دیں کہ اِس مشین کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔

افسوس کہ جب سے بچوں کے سکول کھلے ہیں۔ ٹوسٹر استعمال میں ہی نہیں لایا گیا۔ کیونکہ روزانہ صبح 6 سے 7 بجے تک باقاعدگی سے بجلی جاتی ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ناشتہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ''وفادار توا'' ہی باقاعدگی سے اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔

''توا'' بھی بے چارہ کیسے خود سے اپنی خدمات سرانجام دے سکتا ہے جب تک کہ اُسے روٹیاں پکانے اور ڈبل روٹیاں سینکنے کے لئے آگ میسر نہ ہو۔ اَب شہری زندگی میں لکڑی جلانے کا تو رواج ہے نہیں۔

حکومت نے گھر گھر گیس کنکشن دے رکھے ہیں، وہ الگ بات ہے کہ ہمارے یہاں گیس تو نہیں آتی مگر بل باقاعدگی سے ہر ماہ آتا ہے۔

اس میں نہ تو تاخیر ہوتی ہے اور نہ ہی کبھی بے قاعدگی آتی ہے۔ بجلی کا بھی یہی حساب ہے دو گھنٹہ آتی ہے، ایک گھنٹہ چلی جاتی ہے۔ کبھی ایک گھنٹہ آتی ہے اور دو گھنٹے کے لئے چلی جاتی ہے اور کبھی جاتی ہے تو آتی ہی نہیں ہے۔

گزرے دنوں ہم کسی کے گھر پر مدعو تھے۔ جیسا آج کل یہ کہانی ہر گھر کی ہے۔ بال بچوں کا حال چال پوچھنے کے علاوہ یہ بھی ایک دوسرے سے پوچھا جاتا ہے۔

''۔۔۔اور جناب کیا حال ہے؟''

''۔۔۔اور بچوں کا کیا حال ہے؟''

''۔۔۔کام، کاروبار ٹھیک جا رہا ہے؟''

اور پھر وہی کہانی۔۔۔

''کیا آپ کی گیس آ رہی ہے؟۔۔۔ بجلی کا کیا حال ہے؟ یو پی ایس ٹھیک چل رہا ہے۔ کتنے گھنٹے چل جاتا ہے؟۔۔۔ اور اُس پر کتنے بلب اور پنکھے بیک وقت چل جاتے ہیں۔۔۔ اور ہاں، آپ نے سُنا ہے آج کل سولر سسٹم بھی دستیاب ہے۔ مَیں بھی اُس کے متعلق معلومات لے رہا ہوں۔ سُنا ہے اس بار گرمیوں میں لوڈ شیڈنگ بھی بہت زیادہ ہوئی ہے۔''

''ہاں جی بالکل سردیوں میں یہ حال ہے تو گرمیوں میں تو اور ہی بُرا حال ہوگا۔''

''ویسے آپ گیس کے مسئلے کے حل کے لئے کیا کرتے ہیں؟''

''بس یہی ہمارے ملک کا المیہ ہے، لوگوں میں اس قدر خود غرضی ہے کہ دوسرے کے متعلق تو سوچتے ہی نہیں۔۔۔ ویسے آج کل ایک نئی ڈیوائس آئی ہے۔ کمپریسر تو بہت خطرناک ہوتا ہے، آگ بھی لگ سکتی ہے۔ مگر چائنہ نے خصوصاً اپنے پاکستانی بھائیوں کے لئے یہ ڈیوائس متعارف کروائی ہے۔ یہ یو پی ایس پر بھی چل جاتی ہے۔ آپ چولہے کے ساتھ لگوالیں۔ آپ کے گیس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بھئی ہم نے تو یہی ڈیوائس لگوا رکھی ہے۔''

سو یہ تھیں چند جھلکیاں۔۔۔ ہمارے موجودہ شب و روز اور ہماری آپس کی گفتگو کے موضوعات۔۔ واپس اپنے شب و روز پر آتا ہوں۔

بچوں کو سکول سے لے کر گھر لوٹا تو بیگم نے اطلاع دی کہ سلنڈر کی گیس ختم ہو چکی ہے۔ آج بچوں کو نہلانا بھی ہے اور گرم پانی کرنے کے لئے سلنڈر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مَیں مرکزی سڑک کے قریب واقع سلنڈروں کی دُکان پر پہنچا۔ اطلاع ملی کہ اِن دنوں گیس شارٹ ہے۔ ایک دو روز تک پتہ کیجئے۔ CNG سٹیشنز تو پہلے ہی بند ہیں، پٹرول بآسانی مل نہیں رہا تو کچھ گاڑیاں LPG گیس پر چلنے لگیں۔ اس لئے بھی اس گیس کی شارٹیج ہو گئی۔

دُکاندار نے میرا مایوس چہرہ دیکھتے ہوئے کہا،'' ویسے آپ چند کلومیٹر آگے واقع گیس کی ایجنسی پر پتہ کرلیں وہاں شاید مل جائے۔''

مَیں نے پریشانی کے عالم میں گاڑی اسٹارٹ کی، یہ سوچتے ہوئے کہ اس میں تو ڈیڑھ گھنٹہ قطار میں لگے رہنے کے بعد کوٹہ سسٹم کے تحت صرف ایک ہزار روپے کا پٹرول ڈلوا سکا تھا اور اَب گاڑی پر اس قسم کی آوارہ گردی کے بعد پٹرول کے موجودہ ذخیرہ میں تو خاطر خواہ کمی واقع ہو جائے گی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا، ہم نے تو گھر میں نہ کمپریسر لگوا رکھا ہے اور نہ ہی کوئی چائنیز ڈیوائس ابھی تک ہاتھ لگی ہے۔ یہی سلنڈر ہمارا سہارا ہیں ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔۔۔ کھانا پکانا، ہیٹر جلانا، نہانے کے لئے پانی گرم کرنا۔۔۔ یہ تمام کی تمام سہولتیں ان ہی سلنڈروں کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہمارا گیس کنکشن نہیں ہے۔۔۔۔ وہ بھی ہے، میٹر بھی ہے اور میٹر بالکل صحیح چلتا ہے۔۔۔ اسی لئے تو ہر ماہ گیس کا بل باقاعدگی سے آ رہا ہے اگرچہ گیس نہیں آتی۔ ایک ماہ گیس کا بل جمع نہ کروا سکا تو ڈِس کونیکشن نوٹس آ گیا۔ دوسری بار بھی آخری تاریخ سر پر آ پہنچی۔ موبائل شاپ پر جمع کروانے کی کوشش کی تو وہ بولا،'' جناب آخری تاریخ میں ہم جمع نہیں کرتے آپ کو بینک میں ہی کروانا پڑے گا۔''

بینک پہنچا تو وہاں پر بھی پوری کی پوری پاکستانی قوم قطار میں کھڑی بل جمع کروا رہی تھی۔ اکثریت کے ہاں تو گیس آتی ہی نہیں۔ کچھ کمپریسر کے ذریعے اِس سہولت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور کچھ کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں اُس وقت گیس آتی ہے جب بجلی چلی جاتی ہے۔ پہلے پہل تو مَیں اِس گتھی کو سلجھا نہیں سکا اور اِس مخمصہ میں رہا کہ آخر گیس کے آنے کا بجلی کے جانے سے کیا تعلق ہے؟ تب قطار میں کھڑے ایک ذہین پاکستانی نے بتایا کہ

''اَے کم عقل انسان جب بعض گھروں کے چولہے کمپریسر پر چلیں گے تو دوسرے گھروں کے چولہوں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوگا۔۔۔ اور کیونکہ کمپریسر بجلی سے چلتے ہیں۔ اس لئے بجلی کی لوڈ

شیڈنگ کا براہ راست فائدہ اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جن کے اِردگرد گھروں والوں نے کمپریسر لگا رکھے ہوتے ہیں۔ وہ غریب عوام موقع سے فائدہ اٹھا کر کھانا پکا لیتے ہیں اور تھوڑی بہت حرارت سے گھر گرم کر لیتے ہیں۔''

تب مَیں نے سوچا کہ بجلی کی لوڈشیڈنگ دراصل اُن غریب عوام کی دُعاؤں کا نتیجہ ہوتی ہے جن کے گھر کمپریسر نہیں ہوتے اور بجلی کا آتے رہنا اُن کے گھر کی دُعاؤں کا ثمر ہے جو کمپریسر استعمال کرتے ہیں۔

بجلی سے یاد آیا کہ اپنے ''شب و روز'' کو بہتر بنانے کے لئے ایک دن ہم بڑے شوق سے الیکٹرک راڈ خرید لائے۔ ہماری تو خوشی کی انتہا نہ تھی کہ ہم صرف اڑھائی سو روپے میں اِس بڑی مصیبت پر غالب آ چکے ہیں۔ اب سردیوں میں بھی نہانا آسان ہو جائے گا۔ بس بالٹی میں راڈ لگایا، سوئچ آن کیا اور چند منٹوں میں تیز گرم پانی دستیاب۔ . .''

جس روز مَیں یہ خاص چائنیز ڈیوائس لے کر گھر پہنچا اور دونوں بچوں ایشے اور جوآنہ کو دکھایا تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ خصوصاً ایشے بیٹے نے دلچسپ سوال کرنا شروع کئے۔

''یہ کیا ہے؟ یہ کیسے چلتا ہے؟''

''اِس سے کیا کرتے ہیں؟''

اور اُسے اِس حیرت انگیز ایجاد سے متعارف کروایا گیا تو وہ بہت ہی حیران اور خوش ہوا کہ بس بالٹی میں اِسے رکھ دینے سے پانی گرم ہو جائے گا اور مظاہرے کے طور پر مَیں نے جلدی جلدی بالٹی کو پانی سے بھرا۔ آدھی ہوئی تو بیگم بولیں، ''چیک تو کریں''

مَیں نے راڈ کو پانی میں ڈبو دیا اور بولا،

'' تم ابھی دیکھنا کیسے منٹوں میں پانی کھولنا شروع ہو جائے گا۔ . . ہمارے بچپن میں بڑے ماموں جان انگلینڈ سے ایسا الیکٹرک راڈ لائے تھے اور وہ جادوئی انداز میں فوری پانی گرم کر دیتا تھا''۔

راڈ کی تار جب ساکٹ میں لگانے لگا تو راڈ بذاتِ خود پانی سے باہر نکل آیا۔ مَیں نے بڑی عقلمندی کے ساتھ بیگم اور بچوں کو مخاطب کر کے کہا، ''یہ احتیاط لازمی کرنی ہے کہ راڈ کہیں پانی کے بغیر بجلی میں نہ لگ جائے کیونکہ اِس طرح یہ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا۔''

یہ سُن کر ایشے اور جوآنہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

پانچ سالہ جوآنہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید پھیلاتے ہوئے اور بالٹی سے قدرے پیچھے ہوتے ہوئے بولی،

''ہیں . . . پاپا یہ پھٹ جائے گا . . . پھر کیا ہوگا؟''

مَیں نے جواب دیا، ''کچھ نہیں بیٹا بس پھر راڈ خراب ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر مَیں ایکس ٹینشن وائر (extension wire) ڈھونڈنے چلا گیا۔

جلد ہی لا کر راڈ کو اُس میں لگایا اور پھر خُدا کا نام لے کر سوئچ آن کر دیا۔

چند ہی سیکنڈز میں راڈ کے اِردگرد بُلبلے بننے لگے اور بچے شوق سے دیکھتے ہوئے چلا اٹھے، ''پاپا پانی گرم ہونا شروع ہو گیا۔''

مَیں بھی بولا، ''بیگم دیکھا کتنی اچھی چیز ہے۔ اتنی سردیاں ہم نے اِس سہولت کے بغیر ہی گزار دیں۔ میرے بھی ذہن میں پہلے یہ خیال نہ آیا۔ چلو دیر آئے درست آئے۔''

بچے بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ بُلبلے بنتے دیکھ رہے تھے۔ اور بس پھر پندرہ بیس منٹ تک بُلبلے ہی بنتے رہے، پانی گرم ہونا تھا نہ ہوا۔ ہم اپنا سا مُنہ لئے رہ گئے۔ البتہ ہم دکان دار پر تھوڑے سے گرم ہو ئے تھے۔

غصّے کے عالم میں اُس راڈ کو پانی سے نکالا اور ہاں احتیاط کا دامن ہم نے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا تھا، سوئچ پہلے ہی آف کر دیا تھا کہ کہیں راڈ بے احتیاطی کے باعث ''سڑ'' نہ جائے۔

دِل میں عہد کیا کہ پہلی فرصت میں ہی یہ راڈ دُکان دار کے سر میں مار کے آؤں گا جس نے اِس کی تعریفوں کے اتنے پُل باندھے تھے کہ مَیں اِس احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا کہ پاکستانی اٹھارہ بیس کروڑ عوام میں سے مَیں ہی اکیلا رہ گیا تھا جو اِس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھا رہا تھا۔

افسوس کہ مَیں غصّے کے عالم میں اڑھائی سو روپے والا یہ راڈ دُکاندار کے سر میں مارنے کے ارادے سے اُس کی دُکان پر پہنچا تو وہاں ایک نوجوان دُکانداری کرتا ملا چنانچہ مَیں نے اپنا ارادہ بدل لیا اور اُس کے سامنے اپنا مدعا عاجزانہ انداز میں پیش کیا۔ اُس نے بھی مودب انداز میں جواب دیا۔ '' جناب یہاں خریدی ہوئی چیز واپس نہیں ہوتی۔''

اَب تو میں بھڑک اٹھا کہ جب آپ نے چیز ہی خراب دی ہے تو اُسے واپس کرنا میرا حق ہے۔ وہ بولا ،''کیا آپ نے چیک کر کے نہیں لی تھی؟''

مَیں نے پھر غصیلے انداز میں جواب دیا،'' وہ بھائی صاحب جو یہاں موجود تھے۔''

''جی جی وہ میرے والد ہیں اور اَب بھی موجود ہیں۔''

''ہاں تو وہ کدھر ہیں؟ اُنہوں نے یہ سوچ میں لگا کر نہ جانے مجھے کیوں بلب آن کر کے دکھا دیا حالانکہ مَیں نے یہ روشنی کرنے کے لئے نہیں بلکہ پانی گرم کرنے کے لئے خریدا تھا۔''

اسی اثناء میں اُس نوجوان کے والد محترم بھی دُکان کے اندرونی حصّے سے برآمد ہوگئے اور مجھے پہچان کر بولے۔

''جی جی، مَیں نے آپ کو اِس لئے کہا تھا کہ یہ چار سو روپے والا راڈ لے جائیں، اِس کی کارکردگی زیادہ بہتر ہے۔''

مَیں نے جواب دیا،'' اگر اڑھائی سو والے کی کارکردگی صرف بُلبلے بنانا ہی ہے تو آپ نے کیوں بیچنے کے لئے رکھا ہوا ہے؟ مَیں اِسے واپس کرنے آیا ہوں اور کر کے رہوں گا۔ میرے پاس کوئی حرام کے پیسے تو نہیں کہ بُلبلے بنانے والی مشین پر اڑھائی سو روپیہ خرچ کر دوں۔''

دُکان دار نے خاصے تحمل اور نرم مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا،'' ویسے تو اِس کی شکایت پہلے نہیں آئی، ہم سے تو اکثر حجام یہ والا راڈ لے کر جاتے ہیں۔''

تب مَیں نے سوچا کہ حجام تو محض شیو بنانے کے لئے چھوٹے سے مگ میں یہ راڈ لگا لیتے ہیں، شاید اِس راڈ کی کارکردگی وہیں تک محدود ہوگی۔ مَیں اِس معصوم راڈ سے بالٹیوں کا پانی گرم کروانے کی مشقت لے رہا تھا۔

دُکان دار بولا،'' میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ گھر کے روزمرہ استعمال کے لئے چار سو روپے والا راڈ لے جائیں، ویسے تو ہم الیکٹرونکس کی کوئی بھی شے واپس نہیں لیتے لیکن چلیں آپ تبدیل کروالیں۔ بس ڈیڑھ سو روپیہ مزید دے دیں۔ ۔ ۔ جو راڈ آپ چاہ رہے ہیں وہ یہی والا ہے۔ انشااللہ یہ ویسی ہی کارکردگی دے گا جیسی آپ چاہ رہے ہیں۔''

ایک بار پھر مَیں دُکان دار کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا۔ مَیں نے اپنی رضامندی اور خوشی سے ڈیڑھ سو روپے مزید دیئے اور ایک نیا راڈ لے کر خوشی خوشی گھر پہنچا، ایک بار پھر وہی تمام لوازمات جمع کئے گئے، بالٹی پانی سے آدھی بھری ہوئی، ایکس ٹینشن وائر وغیرہ وغیرہ۔

بڑے فخر کے ساتھ بیوی بچوں کی موجودگی میں اِس نئے راڈ کو بالٹی میں لگا دیا۔ فوراً ہی بُلبلے پیدا ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر مَیں خوشی سے چلانے لگا، اَب صحیح چیز مِل گئی۔ جذباتی ہو کر مَیں پانی کی حرارت چیک کرنے کے لئے ہاتھ سے چھونے لگا تو بیگم چلا اُٹھیں،

''ہائے کیوں کرنٹ پڑوانا ہے؟''

تب مجھے یہ خصوصی احتیاط یاد آئی کہ جب راڈ لگا ہو تو پانی میں ہاتھ نہیں گھسانا چاہیے۔ بچوں کو بھی مَیں نے آئندہ کے لئے اِس احتیاط کو پیشِ نظر رکھنے کو کہا۔

وقت گزرتا گیا، بُلبلے بن بن کر غائب ہوتے گئے اور ایک بار پھر میری اُمیدوں کے بُلبلے بھی پھوٹنے لگے۔ مَیں بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی اُمیدوں پر پانی پھرتا دیکھ رہا تھا، پانی کو گرم ہونا تھا اور نہ وہ ہوا۔ ہاں البتہ چائنہ کی اِس ایجاد سے جس کو دُکان دار نے الیکٹرک راڈ کہہ کر میرے ہاتھوں چار سو روپے کا فروخت کیا تھا اور مجھے ایک بار نہیں بلکہ دو بار ''ماموں'' بنا ڈالا تھا، اُس ایجاد میں سے اَب بُلبلوں کے علاوہ سیاہ رنگ کے ذرات بھی برآمد ہونا شروع ہوگئے تھے جو رفتہ رفتہ پانی میں گھلتے جا رہے تھے۔ مَیں یہی سمجھا کہ ہمیں چار سو میں ایک ایسا چائنیز ڈیوائس مِل گیا ہے جو بغیر پتّی کے پانی کو چائے کا رنگ دے سکتا ہے،

یونہی معلوم ہو رہا تھا کہ گویا تیز پتّی پانی میں گھلتی چلی جا رہی ہے۔ اِس سے پہلے کہ کوئی دھما کہ ہوتا یا کسی اور قسم کے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا، احتیاط کے پیشِ نظر مَیں نے بچوں کو بالٹی سے دُور کر دیا۔ بیگم نے پوچھا،'' یہ کیا بلا لے آئے ہیں آپ؟''

مَیں نے جواب دیا'' شاید راڈ بالکل نیا ہونے کی وجہ سے یہ کالے ذرات برآمد ہو رہے ہیں۔ بعد میں ٹھیک ہو جائے گا۔''

مگر بیگم نے ایسے کیمیائی عمل میں سے گزرے ہوئے پانی کو اپنے اور بچوں کے لئے نقصان دہ اور زہریلا کہتے ہوئے یکسر رَدّ کر دیا۔ مَیں نے سوئچ آف کر کے پانی کا درجہ حرارت چیک کیا۔ افسوس کہ اُس میں رتی برابر بھی فرق نہ پڑا تھا۔ مَیں نے راڈ نکالا اور اُسے لپیٹ کر سٹور میں اُس شیلف پر رکھ دیا جہاں اِس نوعیت کی متعدد چائنیز اشیاء میرا منہ چڑاتی ہیں جنہیں مَیں نے نئے تجربے کے طور پر خریدا تھا مگر افسوس کہ ایسے تجربے اکثر ناکام ہی ثابت ہوئے۔

آخرکار ہمارے شب و روز پھر اُن ہی سلنڈروں کے گرد گھومنے لگے جن کی خبریں آئے دن

سُنتے ہیں کہ سلنڈر پھٹنے سے ایک ہی خاندان کے چار افراد جاں بحق ہوگئے وغیرہ وغیرہ۔ کئی افراد تو اِس خوف کے باعث سلنڈر استعمال ہی نہیں کرتے اور کئی ہم جیسے یہ کہہ کر دِل کو بہلا لیتے ہیں کہ نہیں وہ سلنڈر پرانے اور سستے والے ہوتے ہیں، اِس لئے پھٹ جاتے ہیں، ہمارے والے کی گیج خاصی موٹی ہے اور احتیاط کے طور پر ہم سلنڈر کی فُل گنجائش سے ایک دو کلو گیس کم رکھواتے ہیں۔

اب انسان کرے تو کیا کرے؟ مکانوں کی طرز کچھ یوں ہے کہ کمروں میں لکڑی یا کوئلہ وغیرہ بھی جلایا نہیں جاتا۔

یوں تو کہا جاتا ہے کہ پاکستان ایک ایسا خوش نصیب مُلک ہے جس میں ایک نہیں چار چار موسم پائے جاتے ہیں۔ ہاں اگر یہ موسم شدت اختیار نہ کریں تو پھر خیر ہے۔ مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ سردی ہوتی ہے تو شدید اور گرمی بھی پڑتی ہے تو اِس زور کی کہ جان ہی نکال لیتی ہے۔

سردی گزرنے کے بعد چند مہینے تو مظلوم و مسکین عوام موسمِ بہار سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر پھر زوروں کی گرمی اپنا غضب ڈھانے لگتی ہے اور عوام اُس کا مقابلہ کرنے میں مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اگر موسم بھی شدید ہو تو انسان سامنا کر لیتا ہے مگر یہاں مسئلہ یہ کہ شدید سردی میں گیس ناپید ہو جاتی ہے اور شدید گرمی میں بجلی غائب ہو جاتی ہے۔

یہ اِن ہی سردیوں کی بات ہے مَیں اسلام آباد کسی کام سے روانہ ہوا۔ مگر ائیر پورٹ سے چند کلو میٹر پہلے کچہری کے قریب شدید ٹریفک کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا مُلک ایسا شدت پسند ہو چکا ہے کہ یہاں ہر شے شدید ہوتی ہے۔ مہنگائی کی بات کریں تو وہ بھی شدید، کرپشن اور ناانصافی کو لے لیجیے، وہ بھی شدید۔ ۔ ۔ آبادی میں اضافہ کا رجحان بھی شدید، موسم شدید اور شدید حالات کے باعث اب لوگوں کے مزاج بھی قدرے شدید معلوم ہوتے ہیں۔

مَیں بھی ''شدید'' ٹریفک جام کے باعث ''شدید'' کھچاؤ کا شکار تھا کیونکہ جس دفتر مجھے پہنچنا تھا ویسے تو اُس کا وقت صبح نو سے چار تک ہے مگر فون کرنے پر پتہ چلا کہ پبلک ڈیلنگ گیارہ بجے شروع ہوتی ہے۔ یہ سُن کر تسلی ہوئی کہ چلو چار بجے تک وافر وقت ہے مگر جب وہیں ٹریفک میں بارہ ساڑھے بارہ بج گئے تو مَیں نے متعلقہ شخص کو ایک بار پھر فون کیا اور صورتحال سے آگاہ کیا مگر اُن کی بات سُن کر میرے چہرے پر بھی بارہ بج گئے۔ اُنھوں نے اطلاع دی کہ پبلک ڈیلنگ گیارہ بجے شروع ہوتی ہے اور ایک بجے بند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اب آنے کا فائدہ نہیں۔ فون بند کیا تو مَیں حیرانی سے سوچنے لگا کہ یہ دفتر والے باقی وقت کیسے گزارتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ بعدازاں جب اُس سرکاری دفتر جانے کا وقع ملا تو تمام سٹاف خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اُن کی رُوداد سُنی کہ دس سے گیارہ تک بجلی چلی جاتی ہے چنانچہ کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ ایک سے دو بجے تک کھانے کا وقفہ ہوتا ہے چنانچہ کوئی کام نہیں ہوسکتا اور پھر تین سے چار بجے تک لوڈشیڈنگ ہوتی ہے چنانچہ کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

خیر اُسی شدید ٹریفک جام میں واپس آتے ہیں۔ اُس روز مَیں نے اسلام آباد جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ موقع ملنے پر بائیں ہاتھ جانے والی ایک سڑک کی جانب گاڑی موڑ دی۔ حالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہی تو پتہ چلا کہ آگے چوک میں عوام نے گیس کی قلت کے باعث احتجاجی دھرنا دے رکھا ہے۔

ویسے بھی بیچارے عوام بجلی، گیس کی عدم دستیابی کے باعث اکثر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ تو اب عمران خان صاحب نے اچھا حل بتاتا ہے کہ بیٹھنا ہی ہے تو کیوں نہ دھرنا دے کر بیٹھا جائے، کم از کم مطالبات تو پورے کروائے جاسکتے ہیں اور مسائل کا حل بھی نکل آتا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ دھرنا دینے والوں کا چاہے دم نکل جائے مگر مسائل کا حل نہیں نکلتا۔

یہاں بھی عوام احتجاجی دھرنا دیئے بیٹھے تھے اور اِس کا براہ راست نتیجہ کس کو بھگتنا پڑ رہا تھا، پھر بیچارے عوام کو جو نہ جانے کن کن مسائل سے دو چار ٹریفک بلاک میں پھنسے ہوئے تھے، ایمبولنس کا بھی سائرن سُنائی دیتا تھا مگر وہ بھی بے بسی کے عالم میں صورتحال کے ہاتھوں مجبور ہوئے بیٹھے تھے۔

عوام احتجاجی دھرنوں کے ذریعے جن حکمرانوں تک اپنے مطالبات پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ تو اِس ٹریفک میں پھنسے نہیں ہوتے۔ بلکہ جب وہ سڑکوں سے گزرتے ہیں تو تب بھی بیچارے عوام کو ہی ''کھڈے لین'' لگا دیا جاتا ہے۔ سڑکیں سیکورٹی کے پیشِ نظر خالی کر دی جاتی ہیں اور پھر عوام کو ہی شدید ٹریفک بلاک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں ہم عوام اپنے حکمرانوں کا ٹیلی ویژن کی سکرینوں پر دیدار حاصل کرتے ہیں، وہاں ہمارے حکمرانوں کو بھی عوام کے دیدار کا اعزاز ٹیلی ویژن کے ذریعے ہی نصیب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے دھرنے یا مظاہرے اُس وقت تک جاری رہتے ہیں جب تک متعلقہ اہل کاروں یا افسران کے علاوہ میڈیا والے بھی پہنچ نہ جائیں۔ پھر ٹی وی پر

خبر چلتی ہے اور آخر کار حکمران بھی عوام کے مسائل کے متعلق سُن لیتے ہیں اور پھر کچھ لمحوں کے بعد نجی چینلز پر یہ بریکنگ نیوز آتی ہے کہ وزیراعظم، وزیراعلیٰ یا چیف جسٹس صاحب نے اِس مسئلہ کا ازخود نوٹس لے لیا۔ شکر ہے کہ کچھ نہ کچھ مسائل حل بھی ہو جاتے ہیں اور یقیناً جو مثبت باتیں ہیں اُن کے لئے بھی حکمرانوں یا اپنے مُلک کی تعریف کرنا چاہیئے۔

اب نئے سال کا بڑا تحفہ کہ پیٹرول سستا ہو گیا۔ اِس بات کے لئے بھی ہمیں شکرگزار ہونا چاہیئے۔ کہاں -/110 اور کہاں -/71 روپے! اتنا بڑا فرق۔ . . اتنی کمی۔ مگر افسوس کہ جب پیٹرول 2 روپے لیٹر مہنگا ہوتا تھا تو ٹرانسپورٹر حضرات 2 روپے فی سواری کرایہ بڑھا دیتے ہیں اور اب جب پیٹرول میں پینتس روپے سستا ہوا تو ٹرانسپورٹرز نے یہ کہہ کر کرائے کم کرنے سے انکار کر دیا کہ اب ہر شے پیٹرول سے تو چلتی نہیں اور زندگی کے تمام لوازمات اور اشیائے خوردنی کی قیمتیں جُوں کی تُوں ہیں تو کرائے کیسے کم کئے جائیں۔ خیر حکومت کے دباؤ اور ازخود نوٹس لینے کی وجہ سے کرائے قدرے کم ہو گئے۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ پیٹرول جب بھی مہنگا ہوا ہر دُکاندار، ٹرانسپورٹر یا کاروباری شخص نے ہر چیز مہنگی کر دی مگر جب پیٹرول سستا ہوا تو کسی نے چیزوں کی قیمتوں میں کمی نہ کی اور بڑی تسلی سے یہی کہا کہ ابھی تک کوئی نوٹس قیمتیں کم کرنے کے حوالے سے حکومت کی طرف سے ہم تک نہیں پہنچا، جونہی پہنچے گا تو ہم کم کریں گے۔

گزرے دنوں مجھے بذریعہ موٹروے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ جاتے ہوئے چائے کا کپ تیس، دو روز بعد واپسی ہوئی تو دُکاندار نے پینتیس روپے لئے۔ مَیں نے پوچھا پیٹرول تو سستا ہو گیا۔ چائے کیوں مہنگی کر دی؟ بڑی ناگواری کے ساتھ بولا،'' چائے میں پیٹرول تو نہیں ڈلتا ناں۔''

مَیں نے بھی بات کو منطقی تصور کرتے ہوئے اُس کی بات مان لی۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ وہ موصوف مجھے ماموں بنا گئے تھے۔

سردیوں کے روز و شب تو بتا دیئے اب کچھ گرمیوں کا حال بھی سُن لیجیے۔ گرمی کی شدت نے گزشتہ سال بُرا حال کر رکھا تھا۔ بیگم نے کہا،'' بچوں کے لئے تو اے سی ہے، اپنے کمرے کے لئے بھی لینا ضروری ہے کیونکہ گرمی ناقابلِ برداشت ہے اور ایک ٹن کے اے سی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔''

دراصل اوپر والے پورشن میں ہونے کی وجہ سے گرمی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ مَیں نے اچھا جی کہہ کر وہ لمحہ تو گزار دیا مگر اگلے روز بھی اِس قدر گرم تھے کہ بیگم کا یہ ارادہ ٹل نہ سکا۔ چار و ناچار ہم اے سی والی دُکان پر پہنچ ہی گئے۔ دُکاندار پہلے سے ہی واقف تھا۔ اُس نے علاقے میں لوڈ کی مناسبت سے کہا،'' جناب اُدھر چکری روڈ پر تو پورا وولٹیج نہیں آتا اِس لئے آپ ایک ٹن والا ہی خریدیئے۔''

ہم نے اُس کا مشورہ حسبِ سابق مان لیا اور آخر کار بمعہ اہل و عیال خوشی خوشی سپلٹ یونٹ لئے گھر پہنچے۔ اب اِس کی فٹنگ کا مرحلہ تھا، شدید گرمی کی وجہ سے

قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور اِس کے علاوہ کوئی فِٹ کرنے والا بھی فارغ نہیں مِل رہا تھا۔ آخر چند روز صبر کے بعد یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ اُس کی مزدوری اور فٹنگ کے لئے درکار ساز و سامان پر بھی کافی لاگت آئی۔ تقریباً اِس پراجیکٹ پر اَب تک مبلغ پچاس ہزار جس کے نصف پچیس ہزار ہوتے ہیں خرچ ہو چکے تھے۔ پہلی رات تو سکون کا سانس لیا۔ دونوں اے سی متواتر چلتے رہے مگر پرانے والے کی کولنگ زیادہ تھی اور نئے والے کی کم۔ رفتہ رفتہ گرمی کا احساس پھر اُسی طرح ستانے لگا اور نیا اے سی تو بس سادہ ہوا ہی دیتا رہتا تھا۔ آخر کار پھر فٹنگ والے کو بُلایا، صورتحال کا جائزہ لے کر کہنے لگا،'' جناب آپ کے تقریباً پچیس ہزار خرچ ہوں گے۔ آپ کو سٹیبلائزر کی ضرورت ہے کیونکہ وولٹیج بہت کم ہے۔''

مَیں ایک بار پھر سر پکڑ کر اور دِل تھام کر بیٹھ گیا۔ اَب مزید خرچہ کرنے کی سکت نہ تھی، چنانچہ کبھی پرانا اے سی چلا لیتے اور کبھی نیا والا۔ . . گرمی کے ہاتھوں ایک بار پھر بُرا حال تھا کہ برسات کی پہلی بارش ہوئی اور موسم نے کروٹ لی۔ قدرتی اے سی نے ماحول کو خوشگوار بنا ڈالا۔ شکر ہے کہ جُوں تُوں کر کے گرمیوں کا وہ موسم بھی گزر گیا۔ اُس کے بعد سے دونوں اے سی اخبار چڑھا کر اگلی گرمیوں تک کے لئے محفوظ کر لئے۔ اَب پھر دِل تیز تیز دھڑکتا ہے کہ اگلی گرمیاں آ پہنچی ہیں اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اِس سال پہلے سے بھی زیادہ لوڈ شیڈنگ متوقع ہے۔ چنانچہ کوئی تو جنریٹر کا مشورہ دیتا ہے، کوئی سولر پینل کا اور کوئی مُلک تبدیل کر لینے کا۔ . . بس ہمارے شب و روز یونہی گزرتے رہتے ہیں۔ . . جہاں سردیاں گزر گئی ہیں وہاں اب اگلی گرمیاں بھی گزر جائیں گی۔ ہم بہار اور خزاں کے موسموں سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں۔

موسم گزرتے جاتے ہیں اور ان ہی سردیوں، گرمیوں، بہاروں اور خزاؤں میں زندگی بھی گزرتی جاتی ہے اور آخر کار جہاں اتنی گزری ہے وہاں باقی بھی گزر ہی جائے گی۔

افسانہ

غم کی چنگاری

ناصر معروف

گھنٹی کی آواز آئی، ٹی بوائے تقریباً بھاگتا ہوا باس کے کمرے میں پہنچا اور سوالیہ نظروں سے باس کو دیکھنے لگا۔

''مس فاخرہ کو اندر بھیجو۔'' باس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

ٹی بوائے نے نہایت ادب سے سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے کے جانے کے بعد وہ ادھیڑ عمر شخص اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، اس کی عمر لگ بھگ پچاس سے پچپن سال کے درمیان ہوگی، رنگ سُرخی مائل سیاہ اور نقوش بھی عام سے تھے، مگر لباس سے وہ کوئی رئیس ہی لگتا تھا، فل اے سی، آفس پچیس سے تیس افراد پر مشتمل، امپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس، بظاہر کوئی کمی نہ تھی، کمی تھی تو بس۔۔۔

============

دروازے پر دستک سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی، ایک نسوانی کھنک نے سکوت توڑا:

''می آئی کم اِن سر!'' ایک نہایت سادہ اور معصوم سی لڑکی باس کے سامنے کھڑی تھی، دراز قد، رنگت گندمی، عام سے کپڑوں میں ملبوس مگر سادگی کے حسن کا ایک شاہکار، اس انا پرست شخص نے لڑکی پر حقیری سی نظر ڈالی اور چبھتے ہوئے لہجے میں الٹی سیدھی باتیں سنانے لگا اور باتیں بھی وہ جن کا کوئی سر تھا نہ پیر اور پھر اس سے پہلے کہ وہ لڑکی اپنے دفاع میں کچھ کہتی حکم صادر ہو چکا تھا۔

لیکن آنے والی لڑکی کو اس پہ کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ وہ اس طرح کی صورتِ حال سے واقف تھی، وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ اُسے نوکری سے نکالا گیا ہو، یہ آفت تو ایک سال میں کوئی پانچ سے چھ بار اس پر ٹوٹ چکی تھی، وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جس جگہ باس کی بات نہ مانی جاتی وہاں نوکری کتنے دِن ٹکتی ہے۔

============

''دو دن گزر گئے بجلی نہیں آئی، نہ جانے بجلی کب آئے گی اور پانی نے تو حد کر دی، دو ہفتے سے بند ہے اور اس مہنگائی کے دور میں ٹینکر کے نام سے تو رہے خدا کا نام، جتنے کا پانی کا چھوٹا ٹینکر آتا ہے اُتنے میں دو مہینے کا راشن آ جائے۔'' حمیدہ سبزی کاٹتے ہوئے بُڑبُڑا رہی تھی اور بجلی والوں کو کوس رہی تھی۔

''امی جی، امی جی!'' ایک معصوم سی آواز اُبھری۔

''مس نے کہا ہے کل سے پورا یونی فارم پہن کر آنا، تمھارے جوتے یونی فارم سے میچ نہیں کرتے۔''

اماں نے پیار سے کہا: ''بیٹی! فکر نہ کرو، میں اگلے مہینے نئے جوتے دلا دوں گی اور کل آپ کی مس سے بھی بات کر لوں گی۔''

ماں کے تسلی بھرے جملے سن کر اس معصوم بچی کی آنکھوں میں امید کے جگنو جگمگانے لگے اور وہ خوش ہوگئی، ویسے تو وہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھی، مگر کسی حد تک گھر کے حالات سے بھی واقف تھی۔

============

فاخرہ گھر میں داخل ہونے کے بعد بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی تو جمال کو دیکھ کر اُس کی چیخ نکل گئی، وہ بھاگتی ہوئی جمال کے پاس آئی، اس کے سر پر دائیں کان کے اُوپر زخم نظر آیا، جس میں اب خون جم چکا تھا۔

''امی، امی! یہ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، ہزار بار اسے سمجھایا ہے کہ ان لڑکوں کے ساتھ مت کھیلا کر، امیر ماں باپ کی اولاد ہیں، مگر یہ سنتا ہی نہیں ہے۔'' امی نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

جمال نے اپنی باجی کو اُمید بھری نظروں سے دیکھا، فاخرہ اس کا ماتھا چوم کر تسلی دینے کے لیے پاس ہی بیٹھ گئی، جیسے کہہ رہی ہو کہ امیر لوگ غریبوں کو انسان ہی کب سمجھتے ہیں۔

''فخری ی ی بیٹا، او فخری!'' ایک ناتواں سی بوڑھی آواز آئی، فاخرہ اس آواز کے تعاقب میں ایک کمرے کی طرف بڑھی، جہاں دو آنکھیں اُس کے انتظار میں جگمگانے کی کوشش کر رہی تھیں، وہ بوڑھی آنکھیں جن میں بیک وقت خوشی اور غم کی جھلملاہٹ تھی۔

''جی ابو!'' فاخرہ نے آہستگی سے انھیں پکارا۔

''بیٹی! تو آ گئی؟''

''جی ابو جی! اور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

وہ مسکرا کر بولے: ''ٹھیک ہوں، بس انتظار ہے کہ کب اوپر سے میرا بُلاوا آ جائے۔''

فاخرہ نے تڑپ کر اپنے ابو کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ ہاتھ کیا تھا، ہڈیوں کا ایک ڈھانچا، وہ شاید کچھ دنوں کا مہمان تھا، ڈاکٹر بھی جواب دے چکے تھے اور انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ انھیں آپ گھر لے جائیں،

بس ان کی خدمت کریں اور خوش رکھیں، اب ان کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا، کیونکہ وہ ڈاکٹر بھی سمجھ گئے تھے کہ نہ تو ان کی جیب میں پیسے ہیں اور نہ ہی مریض کے پاس زیادہ وقت۔

یوں دیکھا جائے تو کسی کو بھی اپنی موت کا وقت نہیں معلوم، کسی بھی وقت کسی کی بھی موت کا پروانہ آسکتا ہے، موت کے قریب تو ہم بھی ہوتے ہیں، بس صحت اور بیماری کے دھوکے میں ہم یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں چونکہ اب صحت مند نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

فاخرہ بھی اس بات کی تاب نہ لاتے ہوئے بولی: ''ابو! ایسی باتیں مت کیا کریں، میں ناراض ہو جاؤں گی۔'' فاخرہ کی آنکھ سے ضبط کی آخری حد عبور کرتا ہوا آنسو سیدھا باپ کی ہتھیلی پر آگرا، ابو تڑپ کر بولے: ''پگلی کہیں کی! سدا خوش رہو، آباد رہو، روئیں تمھارے دشمن، میں تو بس یوں ہی کہہ رہا تھا۔''

''ابو! آپ وعدہ کریں، آج کے بعد ایسی کوئی بات دوبارہ نہیں کریں گے۔''

''اچھا فخری بیٹی! دوبارہ ایسی بات نہیں کروں گا، میری توبہ، اب خوش۔'' ابو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معذرت کی۔

بیٹی باپ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے گویا ہوئی: ''ابا! میں آپ کے لیے کھانا اور دوائی لاتی ہوں۔''

============

''امی! کھانے میں کیا بنایا ہے؟'' فاخرہ نے باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس آکر استفسار کیا۔

باورچی خانہ کیا تھا، گھر کا ایک دایاں چھوٹا سا کونہ اور گھر بھی کتنا تھا، ایک کمرا اور ایک چھوٹا سا برآمدہ، جس کے کونے میں اینٹوں کا چولھا بنایا گیا تھا اور ساتھ ہی مسالا جات کے چند ڈبے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے جن میں سے اکثر ان لوگوں کے نصیب کی طرح ویران پڑے تھے۔

امی نے اُسے عجیب سی سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا: ''فاخرہ کیا ہوا؟''

ماں اُس کی نظروں میں چھپے سوال کو جان چکی تھی، آخر وہ ماں تھی، وہ تو بس اس لئے پوچھ رہی تھی کہ بیٹی کا دکھ کچھ کم ہو جائے۔

بیٹی ماں کے گلے لگ کر رونے لگی، رونے سے دل کچھ ہلکا ہوا۔

یہ بات ماں بیٹی اچھی طرح جانتی تھیں کہ اُن کے گھر میں ہر مہینے دو مہینے میں فاقے تک کی نوبت بھی آجاتی تھی اور وہ اب اس کے عادی ہو چکے تھے، مگر اب معاملہ دوسرا تھا، پانچ مہینے سے اس گھر کا کرایہ نہیں ادا کیا گیا تھا، دو مہینے سے دودھ کا بل بھی چڑھ رہا تھا، اب تو گوالے نے دودھ لانا بھی بند کر دیا تھا، ویسے پہلے بھی کتنا دودھ آتا تھا، صرف ایک پاؤ؟، اب وہ بھی بند ہو چکا تھا۔

ان سب سے بڑھ کر فکر اس بات کی تھی کہ چھوٹی بیٹی صدف کی فیس اور جمال کی ساتویں کلاس کی کتابوں کے لیے بھی رقم نہیں تھی اور اگر ان دونوں کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو ابو کی ادویات تو ناگزیر تھیں ہی جس کے بغیر ان کی زندگی خطرے میں آسکتی تھی۔

فاخرہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ یہ کیسی آزمائش کی گھڑی ہے، یہ کیسا امتحان ہے، نہ سر پر سائبان، نہ کوئی عزیز رشتہ دار ہمدرد اپنا تھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تکلیفوں کے اس جنگل میں کسی مسیحا کی منتظر تھیں، جو آئے اور اُن کے سارے دکھ درد بانٹ لے۔

============

''فاخرہ بیٹا کچھ پیسے ہیں؟'' فاخرہ تیار ہو کر جاب کی تلاش میں نکلنے ہی لگی تھی کہ امی نے آواز دی۔

فاخرہ نے قریب آکر امی کو پانچ سو کا نوٹ دیا اور ساتھ ہی دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، دونوں کی آنکھیں ایک ہی بات کی ترجمانی پیش کر رہی تھیں، دونوں ہی جانتی تھیں کہ یہ آخری نوٹ ہے۔

============

فاخرہ کو نوکری کی تلاش میں گھومتے آج پورے دو مہینے ہونے کو آئے تھے، آج اُس کا حوصلہ جواب دے رہا تھا، اسے اپنی کن پٹیوں میں سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی جیسے اُس کا دل ابھی پھٹ جائے گا، اُسے خود اپنے اندر اپنی خاک اُڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ آج اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے گی اور ایسا کیوں نہ محسوس ہوتا کہ وہ جس آفس میں بھی جاتی تھی، باس یا مینیجرز کی بھوکی نظریں اس کا جینا حرام کر دیتی تھیں، ہوس زدہ اور للچاتی ہوئی نگاہوں کو وہ فوراً پہچان لیا کرتی تھی، وہ عورت ذات تھی، اس کا دل کرتا تھا کہ وہ ان ہوس زدہ آنکھوں کو نوچ لے، مگر وہ تو ایک کمزور اور لاچار لڑکی تھی، وہ بھی غریب، شاید اُس کی غربت ہی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا جرم تھا۔

اس نے بوجھل سے قدموں کو اپنے گھر کی دہلیز پر رکھا تو گھر کے دروازے پر پڑا ہوا تالا اس کا منہ چڑانے لگا۔

''آپ کے ابو کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی، گھر والے انھیں ہسپتال لے کے گئے ہیں۔'' پڑوسن نے پوچھنے پر بتایا۔

یہ سنتے ہی جیسے فاخرہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، وہ اُلٹے قدموں گھر سے کچھ دور سرکاری

ہسپتال پہنچی۔

ابوا سٹریچر پر لیٹے ہوئے تھے اور شاید ہوش میں نہیں تھے، ایک پیلے رنگ کی ڈرپ لگی ہوئی تھی جو آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی، امی پاس بیٹھی رو رہی تھیں، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نصیب سے گلہ کریں یا دُنیا سے شاکی ہوں یا پھر رشتہ داروں سے جو اس غریبی میں ان کو بے یارو مدد گار چھوڑے ہوئے تھے۔

اتنے میں ایک درمیانے قد اور سانولی رنگت کی نرس نے آواز دی:

''سُنیے!!! براہ مہربانی آپ لوگ باہر تشریف لے جائیں، I.C.U میں اتنے لوگوں کو اجازت نہیں ہے، اگر کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو ہم آپ کو آواز دے دیں گے۔''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ باہر آ گئے۔

سب بہن بھائی باہر گھاس پر بیٹھ گئے، فاخرہ نے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا، اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جواب دے چکی تھیں، اس نے آنکھیں موند لیں اور سوچنے لگی، سرکاری ہسپتال میں بیڈ تو مل ہی جائے گا، پر دوائی اور ٹیسٹ وغیرہ کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ وہ ٹی بی کے مرض سے اچھی طرح واقف تھی، بھلا وہ اس بیماری کو کیسے بھول سکتی تھی جس نے پچھلے چار سال سے اس کے باپ کو دیمک کی طرح کھا کر کمزور کر کے رکھ دیا تھا اور وہ اپنے باپ کے لیے کچھ نہیں کر پا رہی تھی، وہ ایک فیصلے کرنے کی خاطر دوراہے پر کھڑی تھی، جہاں زندگی اور موت دونوں ہی برابر تھے، کبھی موت کا پلڑا بھاری ہو جاتا، کبھی زندگی کا، اسی کشمکش میں اس کی ماں بڑی محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور پھر اُسی لمحے وہ مشکل ترین فیصلہ بھی اس کے لیے آسان ہو گیا، جیسے اس نے ازلی اور ابدی جنگ سے چھٹکارا پا لیا ہو، جیسے وہ خود اپنی پیرو کار بن بیٹھی تھی، اس کے دماغ کی گردش ایک دم سے رک گئی تھی، کانوں میں جو سیٹیاں بج رہی تھیں وہ دھیرے دھیرے دور ہوتی چلی گئیں، اس کے اندر کا بت اس کے اندر ہی ڈھیر ہونے لگا، اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ رات کے پچھلے پہر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

============

جب اُس کی آنکھ کھلی تو ایک خوبصورت آواز اُس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی:

''الصلاۃ خیر من النوم، الصلاۃ خیر من النوم۔''

اس نے اٹھ کر وضو کیا، نمازِ فجر ادا کی، اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائی کو تسلی دی، اور گھر پہنچ کر کہیں جانے کی تیاری کرنے لگی، اس میں ایک عجیب سا حوصلہ در آیا تھا، اس نے گھر سے نکل کر ایک رکشا روکا، رکشے میں بیٹھ کر ڈرائیور کو ایک مخصوص پتا سمجھایا، رکشے والا اس جگہ سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

تقریباً پینتالیس منٹ بعد وہ آفس نما ایک عمارت کے اندر استقبالیہ پر کھڑی تھی۔

گہری سرخ لپ سٹک لگائی ہوئی ماڈرن لباس میں عام سے خدّ و خال والی ایک لڑکی استقبالیہ میں بیٹھی اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی، آنکھوں میں استفسار تھا، فاخرہ نے اس سے کہا: ''مجھے سر موسی سے ملنا ہے۔''

============

اس نے انٹر کام کا ریسیور اُٹھا کر ''گڈ مارننگ'' کہا اور پھر بولی:

''کوئی مس فاخرہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

اور ریسیور رکھے بغیر ہی اس نے فاخرہ کو باس کے آفس کی طرف جانے اشارہ کیا، فاخرہ کے لیے وہ جگہ نئی نہیں تھی، وہ تین دن پہلے ہی جاب کے سلسلے میں یہاں آئی تھی، یہ ادارہ اس ملک کے بڑے منسٹر کے بھتیجے کا تھا اور سر موسی اس کمپنی کا منیجر ڈائیریکٹر تھا جو یہاں صرف بلیک منی وائٹ منی کا کام اپنی نگرانی میں کرواتا تھا۔

سر موسی نے اسے جتنی تنخواہ کی آفر کی تھی وہ اس کی پہلی جاب کی چھ ماہ کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی، مگر جس کام کی وہ ڈیمانڈ کر رہا تھا وہ کام فاخرہ کے بس میں نہیں تھا۔

فاخرہ کے دماغ میں یہ تین دن کی پرانی باتیں کسی فلم کی طرح چل رہی تھیں۔

اس نے تھوڑی دیر بعد خود کو سیٹھ موسی کے آفس میں پایا، وہ آفس کیا تھا پورا شیش محل تھا، ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے، جب فاخرہ پہلی دفعہ یہاں آئی تھی تو اسے یہ آفس بہت بھلا اور خوبصورت لگ رہا تھا، آج اُسے لگ رہا تھا جیسے ہر چیز اس منہ چڑا رہی ہو، پھر جب سیٹھ موسی پر اس کی نظر پڑی تو اس کی معنی خیز نظروں کو بھانپ کر فاخرہ نے اپنی نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا:

''سر! میں آپ کے پاس کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

============

شام کو جب وہ بوجھل قدموں کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھی تو اُس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی تھی، اُس نے اس گڈی میں سے چند نوٹ الگ کیے، جن سے اُس نے اپنے ابو کے لیے دوائیں خریدیں اور مختلف قسم کے پھل خریدے، لیکن اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اُڑ کر اپنے ابو کے پاس چلی جائے۔

============

نرس تقریباً بھاگتی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے میں آئی اور تیز تیز بولی:

''بیڈ نمبر سولہ کے مریض کی حالت بہت سیریس ہے۔''

ڈاکٹر اور نرسز ایک ساتھ بیڈ نمبر سولہ کی طرف بڑھے، مریض کی سانسیں اُکھڑی اکھڑی سی تھیں اور آنکھیں تو ایسی ہوگئی تھیں جیسے ابھی باہر آ جائیں گی، ڈاکٹر اور نرسز اس کے اوپر جھک گئے، نرس انجیکشن لگانے لگی، وہ مریض بار بار بے چینی کے عالم میں ہاتھ چھڑا رہا تھا، اس کے ہاتھ پیر مسلسل مُڑتے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے وہ اپنے سارے ہنر اس مریض پر آزما چکا تھا، مگر بہتری کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔

مریض کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی، نرسیں اور ڈاکٹر مایوس کن نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

============

فاخرہ ہسپتال کے داخلی صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی، حسبِ توقع ایک عجیب سی بیماری زدہ بُو نے اس کا استقبال کیا، جس طرف نظر اُٹھتی مریضوں اور لواحقین کا رش نظر آتا، کہیں سے گریہ وزاری کی آوازیں آ رہی تھیں اور کسی جگہ مریض کے کراہنے کی۔

فاخرہ بے خیالی کے عالم میں چلتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہی تھی، جیسے کسی سحر زدہ قُوت نے اُسے اپنے بس میں کرلیا ہو، جیسے وہ ایک انجانے راستے پر نجانے کب سے چلتی جا رہی ہو، وہ پہلی منزل کا زینہ طے کر رہی تھی، لیکن اُس کا ہر قدم گویا کسی خلا کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک دم سے کچھ مانوس سی آوازیں اُس کی سماعت سے ٹکرائیں:

''آپی، آپی! ابو۔۔۔۔ آپی! ابو۔۔''

اور پھر اسے ہوش نہ رہا، شاید وہ اپنی سماعت سے ٹکرانے والے کسی ناگوار جملے کی تاب نہ لا سکی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو پتا چلا کہ ابو جان خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں، جب ابو کی میت گھر پہنچی تو ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا، ہر طرف صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی، وہاں موجود ہر شخص پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی، مگر ان میں ایک ایسا بھی تھا کہ جس پر آج دو قیامتیں برپا ہوئی تھیں اور اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس کو روئے؟ اپنے باپ کی میت پر روئے یا اپنی بے چارگی پر۔

نہ کوئی قریبی رشتہ دار تھا نہ کوئی دوست نہ کوئی ہمدرد جو اس مشکل گھڑی میں اس کا درد بانٹتا۔

وہ کس کو بتاتی کہ آج اس کے گھر سے ایک نہیں بلکہ دو جنازے اُٹھ رہے ہیں، ایک اُس کے ہمدرد باپ کا اور دوسرا اس کی عزت کا۔

============

ابھی تدفین کے مراحل سے پوری طرح فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور المیہ اُن کا منتظر تھا۔

فاخرہ نے وہ رقم ماں کے حوالے کی اور آج پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کی فاخرہ اپنی ماں سے نظریں نہیں ملا پائی، وہ زبان سے انھیں کچھ بتانے پر قاصر تھی، مگر آنسوؤں سے لبریز اس کی آنکھیں ماں کو ساری روداد سنا رہی تھیں۔

============

رات کے پچھلے پہر وہ سوچ رہی تھی کہ لوگ اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں؟ کیا اس دنیا کے سارے لوگ ایسے ہی ہیں جن میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں؟ اگر ایسا ہے تو۔۔۔

اس کے ساتھ وہ اُٹھی اور اک طرف چلنا شروع کر دیا، جو زخم اس کی روح پر لگے تھے وہ مہکنے لگے، یہ زخم تھے کہ گلاب تھے جو کھلتے ہی جا رہے تھے، اس کا ہر قدم اسے اس کی منزل کے قریب لے جا رہا تھا، جیسے عمر بھر کا درد اس میں سمٹ آیا ہو، مگر اس درد میں تکلیف نہ تھی، بلکہ تکلیف تو اُس کو لوریاں دے رہی تھی، یہ تو آزمائش کا وقت تھا اور آزمائش بھی آدم ذات کی!!!

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی روح کسی انجانے سُر پر رقص کر رہی ہو، وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب چلے جا رہی تھی، آج وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی، اس وقت اسے رام اور رحیم کا فرق معلوم نہ تھا، اس کی نظروں کے سامنے ایک دھند سی تھی، ایک غبار سا تھا، وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اب اسے پایہ؟ تکمیل تک پہنچانا تھا، جس شیطان نے اسے پہلے اُکسایا تھا آج اس نے پھر اسی شیطان کے ہاتھوں اپنی قوتِ عمل کو فروخت کر دیا تھا، جو اس کے اندر کہیں چھپا بیٹھا تھا، جس نے اس کے اندر سے زندگی کی اہمیت اور موت کا احساس تک ختم کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے ہاتھوں میں ایک بوتل تھی، بے تابی کا غبار اس کی سانسوں کو دھندلا کر رہا تھا، اس کے اندر کی باحیا اور مذہب پرست عورت اپنی حیا اور عزت کا جنازہ اٹھ جانے کے بعد اب مسلسل کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

اور پھر سرد ہوا نے اس کے بدن کو چھو کر محسوس کیا کہ اس کا بدن کسی مائع چیز سے تربتر ہو چکا ہے اور پھر کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ اس گھپ اندھیرے میں ایک چنگاری سی جلی اور اس زندہ لاش کو ہر قسم کے اذیت ناک احساس سے آزادی مل گئی۔

============

انشائیہ

خوشامد

اظہر ادیب

پیدائش کے وقت انسان کی شخصیت ایسی سرزمین کی طرح ہوتی ہے جس پر معصومیت کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہوتا ہے۔ البتہ روشنی کی آخری سرحد پر بربریّت چالاک بلّی کی طرح داؤ لگائے جھپٹنے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ سورج مغرب کی طرف محوِ سفر رہتا ہے۔ اور یہ سیاہ چالاک بلّی زمین سے چپکی آہستہ آہستہ سرکتی رہتی ہے۔ لڑکپن آتے ہی چمکیلا سورج بجھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر پلک جھپکنے میں سیاہ بلّی ایک جست لگا کر اس سرزمین پر اپنا تسلّط جما لیتی ہے۔ گولڈن جوبلی کے بعد سورج تو اگرچہ طلوع نہیں ہوتا لیکن چاند اس کا پرتو لئے اپنی ٹھنڈی اور کومل چاندنی بانٹنے ضرور آتا ہے۔ "وقتِ پیری گرگِ ظالم می شود پرہیزگار" اسی لئے کہا گیا ہے رات کے تسلّط کے دوران خوشامد ہی وہ راگنی ہے جس سے جگنو جگمگانے لگتے ہیں اور چاہے ایک ساعت کے لئے ہی سہی اندھیرے کی فصیل میں دراڑیں ضرور پڑ جاتی ہیں۔

خوشامد وہ لوری ہے جو انسان کے وحشی پن کو سلا دیتی ہے اور صبح کی پہلی کرن بن کر سوئی ہوئی معصومیت کے گلابی گالوں کو چھوتی ہے اور اُسے بیدار کر دیتی ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہو گا کہ خوشامد کرنے والے شخص نے کبھی کسی جابر سے جابر آدمی سے بھی زک اُٹھائی ہو۔ خوشامد کرنے والا ہر آن ایک مبلّغ کی طرح انسان کو مہذب ہونے کا درس دیتا ہے۔ خوشامد نہ کرنے والے معصومیت کو خواب آور گولیاں دینے اور وحشی پن کو مشتعل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنی جھوٹی انا سے اچھے بھلے مہذب انسان کو غار کے زمانے میں واپس دھکیل دیتے ہیں اور پھر خود ہی تختہءِ مشق بن کر اپنی مظلومیت کی داستانیں سناتے سناتے عمریں بتا دیتے ہیں۔ خوشامد کرنے والے کو اپنی جھوٹی انا سے زیادہ اپنی عزت، اپنے بچوں کا مستقبل اور نانِ جویں عزیز ہوتا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے سپاہی کی طرح خود کو کیموفلاج کئے رہتا ہے اور اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے نہ صرف خلقِ خدا کو فساد سے بچائے رکھتا ہے بلکہ خود بھی تلوار اُٹھائے بغیر اپنی جگہ محفوظ و مامون رہتا ہے اور کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھتا۔

بچے کا ضد کرنا یا دوسرے بچوں کو مار پیٹ کر خوش ہونا اُسکے فطری وحشی ہونے کی دلیل ہے۔ ضد میں آئے ہوئے یا غصّے میں بپھرے ہوئے بچے کو والدین ہمیشہ بہلا پھسلا کر راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہلانا پھسلانا بھی دراصل خوشامد ہی کا ایک روپ ہے۔ البتہ ہم نے خفّت سے بچنے کے لئے اس کا نام بدل دیا ہے۔ خوشامد کرنا ہرایرے غیرے کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ وہ صلاحیت ہے برسوں ریاضت کرنے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جیسے نقل کرنے کے لئے عقل کا ہونا ضروری ہے اسی طرح خوشامد کرنے کے لئے بھی بلا کی فہم و دانش درکار ہوتی ہے۔ خوشامد کرنے والے کا قیافہ شناش اور ماہرِ نفسیات ہونا ضروری ہے۔ ماتھے پر پڑے ہوئے بل، ابرو کے ہلکے سے ہلکے اشارے۔ آنکھوں میں جلتی بجھتی شمعوں اور غیر محسوس طور پر پھسلتے سکڑتے لبوں کی تحریر پڑھنے والا ہی اس مقامِ بلند کا حقدار بنتا ہے۔ اس مقام کو حاصل کرنے والے سے لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔ دراصل لاشعوری طور پر وہ بھی اس مقام تک پہنچنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی نااہلی اور کج فہمی کی بنا پر ناکام رہتے ہیں اور تب حسد کا جذبہ انتقام اور نفرت کے جذبے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہ لوگ کچھ نہ کر سکنے کے سبب اس قابلِ تعظیم شخص کو انتہائی حقارت سے "خوشامدی" کا لقب دے دیتے ہیں۔ اس ایک لفظ میں اُن کا احساسِ شکست، حسد، اُنکی ناکام آرزوئیں اور حقارت کے جذبات سبھی کچھ سمٹ آتا ہے۔ اور وہ اس خنجر کے وار کر کے تسکین محسوس کرتے ہیں۔ اگرچہ اُنکی اس کاروائی سے مدِ مقابل کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔

میرا ایک ماتحت ہے زید دیر سے آنا اور وقت سے پہلے چلے جانا اُسکی سرشت میں شامل ہے۔ میں روزانہ اُسے اپنے غصّے کا نشانہ بنانے کا منصوبہ بناتا ہوں لیکن وہ جیسے ہی میرے سامنے آکر لجاجت سے سلام کرتا ہے اور اپنی کسی نئی مجبوری کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ میری سخاوت اور فراخدلی کا دلکش راگ الاپتا ہے، میرے اندر غرّانے والا وحشی بے بس ہو جاتا ہے۔ بلکہ اُسکی دی ہوئی کھٹ مٹی گولیوں سے منہ کی کڑواہٹ ختم ہو جاتی ہے اور میرے اندر سویا ہوا ننھا سا بچہ لہک کر بیدار ہوتا جاتا ہے۔ مجھے اپنا وجود ایک ہلکے پھلکے غبارے کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے جس میں زید کی خوشامد گیس کی طرح داخل ہوتی ہے اور مجھے آہستہ آہستہ زمین سے بلند کر کے میرا رشتہ افاقیت سے جوڑ دیتی ہے۔ اس سارے عمل کے دوران میرا دھاگہ ہمیشہ زید کی اُنگلی سے لپٹا رہتا ہے۔ میری بلندی اور میرے سفر کے رُخ کا تعین یہی اُنگلی کرتی ہے۔ بعض اوقات تو زید بڑے غیر محسوس

طریقے سے مجھے کرسی سے اُٹھا کر اپنی جگہ کھڑا کر دیتا ہے اور خود میری کرسی پر براجمان ہو کر بڑی شریر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتا ہے۔ ایسے وقت میں غیر ارادی طور پر میں اُس گاڑی کے روپ میں ڈھل جاتا ہوں جسکی ڈرائیونگ سیٹ پر زید بیٹھا ہوتا ہے۔ میرے اندر جلنے بجھنے والی تمام روشنیاں اُسکے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔ میرا چلنا۔ رُکنا اور مڑنا اُسکے ہاتھ کے ہلکے سے لمس کا محتاج ہوتا ہے۔ میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُسکے ہونٹوں سے برآمد ہونے والے منتر کی گرفت میں آجاتا ہوں اور وہ کسی عاملِ کامل کی طرح میری شخصیت پر چھا جاتا ہے۔ زید کی طرح میرا ایک اور ماتحت ہے بکر۔ وہ زید سے بڑھ کر زیرک ہے۔ جب میرے دفتر میں میرے بہت احباب اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کرنے کے لئے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ وہ آتا ہے اور مجھے میری خاندانی وجاہت، سخاوت، دلیری اور دریا دلی کی الف لیلی سنانے لگتا ہے۔ اُسکی زبان میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ ایک لمحے کو تو مجھے بھی اس الف لیلوی داستان پر یقین آجاتا ہے اور خود بخود میری گردن کے پٹھے اکڑ جاتے ہیں ایک دن بکر میرے دوستوں کی موجودگی میں آ کر کہنے لگا "سر! میں نے بیس سال تک آپ کے بابا کی ماتحتی میں فوج میں کام کیا ہے۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح فرخدل اور سخی تھے۔ وہ ہاکی کھیلا کرتے تھے۔ ہاکی کا کھیل دیکھتے دیکھتے میرے بال سفید ہو گئے ہیں مگر اُن جیسا مشاق کھلاڑی مجھے آج تک دنیا کی کسی ٹیم میں دکھائی نہیں دیا۔ ایک بار بال اُنکے پاس آجاتی بھی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت گول نہیں بچا سکتی تھی۔ اور ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ کسی کھلاڑی نے اُن سے بال چھین لی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے بال اُنکی ہاکی سے چپک گئی ہے۔ واہ واہ، سبحان اللہ۔ کیا ریس تھی بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چیتا اپنے شکار پر جھپٹ رہا ہے۔" اگر چہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے بابا نے کبھی ہاکی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ لیکن بکر کے بیان پر یقین نہ کر کے میں دوستوں کے سامنے اُٹھے ہوئے سر اور اکڑی ہوئی گردن میں خم نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بابا کی ساری زندگی ہاکی کھیلتے گزری ہے اور انھوں نے اس میدان میں بڑے عظیم معرکے سر کیئے ہیں جنھیں نامعلوم وجود کی بنا پر وہ مجھ سے چھپاتے رہے ہیں۔

مجھے ہمیشہ ایسے لوگوں سے چڑ رہی ہے جن کا دعوی ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کبھی خوشامد نہیں کی۔ حالانکہ زندگی کے خاکے سے خوشامد کا رنگ اُڑ جائے تو ٹیڑھی میڑھی بے رنگ لکیروں کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ محبت، عقیدت، شفقت اور دوستی تمام جذبے خوشامد کے مہذب روپ ہیں۔ جب ایک محب اپنے محبوب کے حسن کی تعریف کرتا ہے تو دراصل اُسکی خوشامد میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ یا جب خاوند اپنی بیوی کی تعریف کرتا ہے تو اُس کا مقصد اپنی کسی ایسی کوتاہی پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے جس کے ظاہر ہو جانے سے گھر میں ایسی مہابھارت چھڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے جس میں اُسکی شکست یقینی ہوتی ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ اُس کا اسلحہ بودا اور اُسکی سپاہ بزدل ہیں جبکہ حریف کے پاس جدید ہتھیاروں سے لیس لشکرِ جرار موجود ہے۔ چنانچہ اس مشکل وقت میں وہ خوشامد کے مجرب نسخے کو استعمال کرتا ہے اور ماحول کو پُرامن بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہمارے ایک ادیب دوست کے ساتھ پیش آیا۔ ایک دن جب وہ گھر پہنچے تو اُنکی بیگم غصے میں لال بھبھوکا ہوئی بیٹھی تھیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی لپٹ پڑیں "سنا ہے تم اپنے دوستوں سے کہتے پھرتے ہو کہ میری بیگم بڑی جابر ہے اور میں اُس سے بہت ڈرتا ہوں" ہمارے ادیب دوست کو اپنی عافیت خطرے میں نظر آئی تو اُنھوں نے فوراً خوشامد کا منتر جپنا شروع کر دیا" بیگم! بھلا تم جیسی اچھی خاتون کی شکایت میں کر سکتا ہوں؟ اور یوں بھی میں کوئی تم سے ڈرتا تھوڑا ہی ہوں کہ لوگوں سے کہتا پھروں" اور یوں وہ گھر میں ہنگامی حالات کے نفاذ کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔

خوشامد وہ علم ہے جو انسان کو سلیقہ سکھاتا ہے۔ جب خوشامد کرنے والے نے آپ سے کوئی بات منوانی ہوتی ہے۔ تو وہ جاہلوں کی طرح ایک دم سے اپنا مطلب بیان نہیں کرتا۔ بلکہ پہلے زمین کے ایک خوبصورت قطعے کو ہموار کر کے اُسکی صفائی کرتا ہے پھر اُس پر چھڑکاؤ کرتا ہے۔ ایک مرصع اور منقش تخت لا کر آپ کے لئے بچھاتا ہے۔ اگربتیاں سلگاتا ہے۔ آپ کے گلے میں موتیا اور چنبیلی کے ہار ڈال کر آپ کے سر پر زریں تاج رکھنے کے بعد آپ کو اس تخت پر بٹھاتا ہے اور خود سائل بن کر آپ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ تب آپ کے اندر چھپا ہوا حاتم طائی زقند لگا کر باہر آجاتا ہے اور آپ بلا حیل و حجت سائل پر سخاوت کے موتی نچھاور کرنے لگتے ہیں۔

خوشامد صلح کا سفید جھنڈا ہے جو فوراً متحارب شخصیتوں کو فائر بندی پر مجبور کر دیتا ہے۔ البتہ اسے لہرانا حوصلے، جرات، فراخدلی اور امن دوستی کے جذبے کے بغیر ممکن نہیں۔ اُس شخص کی عظمت میں کسے کلام ہو سکتا ہے جو اس عہدِ فتنہ گر میں سفید جھنڈا لئے کھڑا ہو۔ اس لئے میرے خیال میں مستقبل پر چھائی ہوئی شکوک و شبہات اور غیر یقینی کی دھند ہٹانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ خوشامد کی باقاعدہ تعلیم اور تربیت کا بندوبست کیا جائے اور ہر کامیاب خوشامدی کو امن کا نوبل پرائز دیا جائے۔

سورج بھی ہو رہا ہے جدا آج شام کو
آنے لگی ہے ایک صدا آج شام کو
نازاں ہے کوئی عقدہ کشا آج شام کو
یہ ساتھ گا رہی ہے فضا آج شام کو
پڑھتی رہی نمازِ وفا جس کے عشق میں
وہ ہو گیا ہے کیسے خفا آج شام کو
میں جانتی ہوں محوِ ساعت ہے اب خدا
یہی گنگنا رہی ہے صبا آج شام کو
میں ڈر رہی ہوں تیز ہواؤں کے شور سے
اُڑتی رہی ہے ساتھ رِدا آج شام کو
ہے نقطہ عروج پہ احساسِ تشنگی
بچے بھی مانگتے ہیں دُعا آج شام کو
اُس کی عطائے خاص پہ حیراں ہوں اس قدر
رنگِ سخن ملا ہے نیا آج شام کو
خاموشیوں سے محوِ تکلم نہ ہو سکوں
حُسنِ نظر سنوار کہا آج شام کو
اس سال شام پھر میرا اعزاز بن گئی
رشتہ تو اس سے ٹوٹ گیا آج شام کو
آ جا گھنی ہے چھاؤں شجر سایہ دار کی
ان پربتوں کے پار کہا آج شام کو
آدابِ نظمِ دوراں سکھایا تو آج نے
بختِ چمن سنوار کہا آج شام کو
تم احترامِ فصلِ بہاراں نہ کر سکے
پھر سال ایک رُوٹھ گیا آج شام کو
للہ اپنے غم کا مداوا نہ ہو سکا
چھانے لگی ہے غم کی گھٹا آج شام کو

نغمے نشاط و کیف لیے ریگزار میں
پھر گل کھلائے گی یہ صبا آج شام کو
سب کو تو غم کی عظمتیں پہچانتی نہیں
دیکھیں گے کون آیا گیا آج شام کو
بسمل چمن کی روح میں تحلیل ہو کے دیکھ
ملتے رہیں گے درسِ وفا آج شام کو

بسمل صابری/ساہیوال

کبھی چراغ کبھی راستہ بدل کر دیکھ
بہت قریب ہے منزل ذرا سا چل کر دیکھ
ترے حصار سے باہر نہیں زمان و مکاں
تو میری طرح کسی آئنے میں ڈھل کر دیکھ
فقیر بن کے میں آیا ہوں تیری چوکھٹ پر
یہ کوئی اور نہیں ہے ذرا سنبھل کر دیکھ
نگار خانۂ گردوں کو راکھ کرتے ہوئے
ذرا سی دیر کسی طاقچے میں جل کر دیکھ
زمین تنگ ہوئی جا رہی ہے لوگوں پر
حدودِ قریۂ جاں سے کبھی نکل کر دیکھ
رواں دواں ہیں کسی سمت میں کہ ساکت ہیں
پھر ایک بار ستاروں کو آنکھ مل کر دیکھ
عجیب لطف ہے ترکِ نشاط میں ساجد
جو ہو سکے تو مری بات پر عمل کر دیکھ!

غلام حسین ساجد/لاہور

حضورِ دوست بھی آیا نہیں قرار مجھے
بہت کیا مری وحشت نے شرمسار مجھے
اُتر رہی ہے سیاہی مری رگ و پے میں
کسی چراغ کا رہتا ہے انتظار مجھے
کسی کی پھول سی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد
نہیں رہا گل حیرت پہ اعتبار مجھے
بھٹک رہا ہوں مگر کھو نہیں سکا اب تک
ابھی بھلا نہیں پایا ہے کردگار مجھے
نگارخانۂ انوار میں اُترتے ہوئے
کیا ہے کون سی صورت نے پھر شکار مجھے
کمند ڈالنے نکلا ہوں آسمانوں پر
مگر نہیں ہے زمیں پر بھی اختیار مجھے
گلہ نہیں ہے مجھے اپنے دوستوں سے کچھ
کیا ہے پنجہ اعدا نے تار تار مجھے
نبھا رہا ہوں میں کس شوق میں زمانے سے
اگر ادا بھی کرنی ہے رسم دار مجھے
مری نحیف صداؤں پہ کان دھرتے ہوئے
تو میرے رنگ میں کھو کر کبھی پکار مجھے
وہ ہست و بود کی زنجیر توڑنے والا
کرے گا اپنے اسیروں میں کب شمار مجھے
نیام کر نہیں پاتا ہوں تیغ آسائش
ستا رہی ہے کوئی شکل بار بار مجھے
بلا رہی ہے مجھے آبِ آینہ ساجد
کہ اپنے آپ پہ آنے لگا ہے پیار مجھے

غلام حسین ساجد/لاہور

اس قدر شہر میں سایوں کی کمی لگتی ہے
پیڑ کیا شاخ کی چھاؤں بھی گھنی لگتی ہے
ہو گیا کیا؟ تجھے کلیوں کا شگفتہ ہونا
مسکراہٹ ترے ہونٹوں میں دبی لگتی ہے
اتنی مشکل بھی نہیں دار و رسن کی منزل
میرے اپنے ہی تجسس میں کمی لگتی ہے
جھکنا چاہا نہ جنھوں نے لبِ دریائے فرات
تشنگی ان کے ہی ہونٹوں پہ بھلی لگتی ہے
میں جسے پھاند کے آیا تھا اُجالوں کے لیے
راستے میں وہی دیوار کھڑی لگتی ہے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو تو پڑھ لوں لیکن
ایک تحریر جبیں پر بھی لکھی لگتی ہے
جس نے دیکھا تمھیں میری ہی نظر سے دیکھا
میری بینائی زمانے میں بٹی لگتی ہے
کیا کہوں کیا نہ کہوں سوچ رہا ہوں نصرتؔ
ظلم کے سامنے چپ بھی تو بری لگتی ہے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

کیا کرامت ہوئی خدا جانے
گلشنوں میں ڈھلے ہیں ویرانے
اتنے عائد ہوئے ہیں جرمانے
ہم ادا کر رہے ہیں ہرجانے
جب فلک سے ہوئی مری نسبت
حشر برپا کیا ہے دنیا نے

زہے قسمت وہ آج آئے ہیں
وادیٔ ذہن و دل کو مہکانے
اک نئی سوچ لے کے جائے گا
جو بھی آئے گا مجھ کو سمجھانے
شمع جس وقت جلوہ زا ہوگی
دور کیسے رہیں گے پروانے
کون دہرائے، کون یاد کرے
جیسی طرزوں کے ہیں نئے گانے
خامیاں ہیں میری عیاں مجھ پر
کوئی مجھ کو نہ "خوب" گردانے
پورا اُترے تو کس طرح راشدؔ
اپنے اپنے ہیں سب کے پیمانے
میری پہچان بن گئے راشدؔ
میں نے لکھے جو چند افسانے

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

گزرتے وقت کا ہم راز ہونا چاہیے تھا
ہمیں بھی کچھ زمانہ ساز ہونا چاہیے تھا
میانِ دل ستادہ ہے جہاں دیوارِ محبس
وہیں پہ در دریچہ باز ہونا چاہیے تھا
پناہیں ڈھونڈتا ہے میرؔ کی جذباتیت میں
جسے اقبالؔ کا شہباز ہونا چاہیے تھا
کسی کی ترجماں کیوں ہو کہ میری شاعری کو
مری ہی فکر کا غماض ہونا چاہیے تھا
مگر افسوس اپنے آپ سے بھی بے خبر ہے
جو شاعر عہد کا نباض ہونا چاہیے تھا
صداقت میں اگر کم تر نہیں جذبات اپنے
تو ہم کو عشق میں ممتاز ہونا چاہیے تھا
غضنفرؔ بے تعلق ہو گئے ہیں جس جگہ ہم
وہیں سے ربط کا آغاز ہونا چاہیے تھا

غضنفر عباس سیّد/ساہیوال

بچشمِ قلب جو بیدار ہو نہیں سکتا
تری نظر کا گرفتار ہو نہیں سکتا
حقیقتیں کبھی جھٹلائی جا نہیں سکتیں
گماں یقیں سے نمودار ہو نہیں سکتا
ترے وجود کا اقرار میں کروں نہ کروں
ترے وجود سے انکار ہو نہیں سکتا
یہ اور بات ہے، دستک دیے بنا، نہ کھلے
مگر وہ در کبھی دیوار ہو نہیں سکتا
کسی خیال سے خاموش ہوں ابھی، ورنہ
تماشا کب سرِ بازار ہو نہیں سکتا
جسے بھی خواب کے عالم میں تو دکھائی دے
وہ شخص نیند سے بیزار ہو نہیں سکتا
کسی عدو سے بھلا کیا لڑے گا وہ آکاشؔ
جو خود سے برسرِ پیکار ہو نہیں سکتا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

شاعری (غزل، نظم)

معاملاتِ محبت کو دل لگی نہ سمجھ
مرے مزاج! مجھے خود سے اجنبی نہ سمجھ
نظر وہی ہے جسے حد کی کوئی قید نہ ہو
فقط اُجالا ہی آنکھوں کی روشنی نہ سمجھ
وہ زیست اور ہے، جس کو نہ آئے موت کبھی
بدن میں سانس کی مہلت کو زندگی نہ سمجھ
یہ کائنات بنائی گئی ہے میرے لیے
کوئی بھی چیز یہاں مجھ سے قیمتی نہ سمجھ
بڑائی یہ ہے کہ دشمن کے دل میں گھر کر لے
شکست دینا مخالف کو، برتری ن ہ سمجھ
بچا رکھا ہے اگر تو نے کوئی داؤ ابھی
یہ چال میری طرف سے بھی آخری نہ سمجھ
ملا دیا ہے غرض نے ہماری راہوں کو
نمو پذیر تعلق کو باہمی نہ سمجھ
مرے خیال کی پاکیزگی تو دیکھ ذرا
نہیں سمجھتا مرے فن میں پختگی، نہ سمجھ
بغیر اُس کے رضا کے بھی پائے گا تکمیل
ارادہ کوئی مرا ایسا ذہنی نہ سمجھ
یہ امتحان کے لمحات ہیں سبھی آکاشؔ
سو غم کو غم نہ سمجھ اور خوشی، خوشی نہ سمجھ

احمد سبحانی آکاشؔ/لاہور

دل سے اک شخص کو رخصت نہیں ہونے دوں گی
بارِ دیگر میں محبت نہیں ہونے دوں گی
عکس میں ڈھل کے نکل آؤں گی تجھ سے باہر
آئنے، میں تجھے حیرت نہیں ہونے دوں گی
سایہ بن کر میں چلوں گی ترے آگے پیچھے
اپنی ہم راہی کی عادت نہیں ہونے دوں گی
دارِ حق پر سرافراز کروں گی خود کو
دستِ باطل پہ میں بیعت نہیں ہونے دوں گی
سطحِ پانی پہ بہے جاؤں گی میں مثلِ حباب
اپنی گمنامی کو شہرت نہیں ہونے دوں گی
سچ کا اظہار کچھ اس طور کروں گی اب کے
حرف لکھوں گی، حکایت نہیں ہونے دوں گی

ڈاکٹر شاہدہ دلاورؔ/لاہور

شاخِ سرسبز پہ کچھ روز سکونت کیجئے
پھر بصد شوق پرندوں پہ حکومت کیجیے
عین ممکن ہے نہ راس آئے نئی آب و ہوا
زخم بھر جائے تو پھر شہر سے ہجرت کیجیے
سیکھ لیں پہلے، اطاعت کی زباں، عجزِ بیاں
پھر بھلے حرف و حکایت سے بغاوت کیجیے
وہ عدو ہو کہ بھکاری، یا اماں کا طالب
در پہ آ جائے تو ہر شخص کی عزت کیجیے
صرف اپنی ہی تجوری کو نہ بھرتے جائیں
جو تہی دست ہیں، ان پر بھی عنایت کیجیے
عشق کے پلڑے میں رکھنا ہیں اگر سود و زیاں
اس سے بہتر ہے کوئی اور تجارت کیجیے
ہم سے ناراض ہوئے، پیڑ، پرندے اور لوگ
بولیے شہر میں اب کس سے شکایت کیجیے

ڈاکٹر شاہدہ دلاورؔ/لاہور

جو تیری دید کو ترسا بہت ہے
اُسے یہ ہجر کی دنیا بہت ہے
محبت کے سمندر میں نہ اُترو
یہاں پانی ابھی گہرا بہت ہے
کبھی آؤ اسے آباد کرنے
مرا ویران دل تنہا بہت ہے
ہمیں لعل و جواہر سے غرض کیا
کہ چاہت کا تری گہنا بہت ہے
بڑی مہنگی پڑے گی زندگانی
لہو انسان کا سستا بہت ہے
ابد تک تشنگی قائم رہے گی
ازل سے دل مرا پیاسا بہت ہے
تمہیں بھی چھین لے جائے نہ کوئی
تمہارے بارے میں سوچا بہت ہے
سمجھتے ہیں ہمیں اپنا وہ اخترؔ
ہمارے واسطے اتنا بہت ہے

حکیم سلیم اخترؔ/لاہور

میں بھنور سے اپنی کشتی کو بچا کر لے گیا
تا بہ ساحل میرا عزمِ نو اُٹھا کر لے گیا

وہ کوئی سیل بلا یا وقت کا طوفان تھا
جو امیر شہر کے تیور اُڑا کر لے گیا
ایک ہی باقی بچا تھا بام پر روشن چراغ
اُس کو کیا سوجھی کہ اُس کو بھی بجھا کر لے گیا
یہ تو میرا حوصلہ تھا جو مرے ہمراہ تھا
دار کی منزل تلک مجھ کو چلا کر لے گیا
آج تک اُلجھا ہوا ہوں خواب کی تعبیر میں
خواب میں وہ اک گلِ تازہ دکھا کر لے گیا
جس کو اپنا ہم نفس اور ہم نوا سمجھا ندیم
دل اثاثہ تھا ہمارا وہ چرا کر لے گیا

ریاض ندیم نیازی / سبی

دریا میں دشت، دشت میں دریا سراب ہے
اس پوری کائنات میں کتنا سراب ہے
روزانہ اک فقیر لگاتا ہے یہ صدا
دنیا سراب ہے ارے دنیا سراب ہے
موسیٰ نے ایک خواب حقیقت بنا دیا
ویسے تو گہرے پانی میں رستہ سراب ہے
کھلتا نہیں ہے ریت ہے پانی کہ اور کچھ
میری نظر کے سامنے پہلا سراب ہے
پوری طرح سے ہاتھ میں آیا نہیں کبھی
وہ حسن بے مثال بھی آدھا سراب ہے
سورج کی تیز دھوپ میں دھوکہ ہر ایک شے
کالی گھٹا سی رات میں سایہ سراب ہے

باغِ شب میں رفتگاں کے پھول ہیں
یہ ستارے آسماں کے پھول ہیں
روشنی کے ساتھ خوشبو کی دھنک
زُلف میں جانے کہاں کے پھول ہیں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں چاروں سمت میں
جس جگہ پر اُس جہاں کے پھول ہیں
اک طرف چلتی ہے تیغ گفتگو
اک طرف میری زباں کے پھول ہیں
تھوڑا تھوڑا غور سے گر دیکھئے
یہ بھنور آبِ رواں کے پھول ہیں
سرسراہٹ ہوبہو بھنورے سی ہے
تیر بھی میری کماں کے پھول ہیں
جھانکیے گا دل کسی درویش کا
اُس مکاں میں لامکاں کے پھول ہیں

اے کاروانِ صوت و صدا احتیاط ہو
مضطر ہے بزمِ ذات ذرا احتیاط ہو
ہم ہی رہینِ چشمِ تماشا تھے کیا کہیں
کہتا تو تھا اک آبلہ پا احتیاط ہو
کیا یہ ضرور ہے کہ مراسم ہوں دشت سے
کیا یہ ضرور ہے کہ سدا احتیاط ہو
کہنے کو ہم بھی کہتے ہیں دل سے ذرا سنبھل
پر آپ ہی بتایئے کیا احتیاط ہو
سبطینؔ میرے واسطے انسان ہے عظیم
اتنی بھی کیا یہ نامِ خدا احتیاط ہو

سبطین رضا / لاہور

بہت دنوں یونہی دھوکا رہا یہ میں تو نہیں
تمام شہر میں کہتا پھرا یہ میں تو نہیں
نجانے کون ہے میرے سوا، یہ میں تو نہیں
کہ آ رہی ہے مسلسل صدا یہ میں تو نہیں
یہ کون ہے جو بصد عجز ڈھونڈتا ہے فریب
ادھر ہٹو کہ میں دیکھوں ذرا یہ میں تو نہیں
زمانہ اتنی رعونت سے بات کرتا ہے
کبھی کبھی مجھے خود بھی لگا یہ میں تو نہیں
کئی طرح سے زمانے کو آزماؤں گا
تجھے بھی کہہ دوں گا سبطینؔ، جا یہ میں تو نہیں

سبطین رضا / لاہور

دل بھی کام بنا جاتا ہے
اس کا نام لکھا جاتا ہے
جب بھی پیار چلا جاتا ہے
کتنی دور گلہ جاتا ہے
عشق بڑا اک روگ ہے پیارے
اشکوں میں اُلجھا جاتا ہے
اس سے بچھڑنے کا منظر بھی
آنکھوں کو برسا جاتا ہے
روتے روتے ہنس دیتا ہوں
کون مجھے بہلا جاتا ہے
ساون رُت کا بہتا پانی
آنکھوں میں کیوں آ جاتا ہے

شاعری (غزل، نظم)

دیکھو ساحل پر ہی رہنا
پیار کا دریا کھا جاتا ہے
جانے والا جاتے جاتے
یادوں کو سمجھا جاتا ہے
اتنا کافی ہے وہ دل کے
زخموں کو سہلا جاتا ہے
آنکھوں کی برسات میں دل کا
سورج بھی گہنا جاتا ہے
پوچھوں گا املاک سے مل کر
جانے کیوں گھبرا جاتا ہے

املاک احمد جدران/ اوکاڑا

کبھی تو پاس بٹھا کر گزارشات سنو
جو آ سکی نہ زباں تک وہ دل کی بات سنو
کسی بھی موڑ پہ تھاما نہیں کسی نے ہاتھ
بہت عجیب ہیں میرے معاملات سنو
اسی لیے تو پکارن کوئی نہیں آتی
اُجڑ گیا ہے مرے دل کا سومنات سنو
اگر فراغ ملے حُسن کی نمائش سے
جو ہم پہ گزرے محبت میں سانحات سنو
فقط بہار کے موسم میں جھومتے نہ رہو
خبر خزاں کی سناتے ہیں پات پات سنو
پکارتے ہیں تمھیں دھڑکنوں کے ساز وسخن
سنا رہی ہیں جو آنکھیں نگارشات سنو
عطائے خاص ہے مجھ پر میں آفتاب ہوا
یہ وقت کم ہی بناتا ہے شخصیات سنو

آفتاب خان/ لاہور

وہ اپنے وعدے بھلا چکا ہے
ہمیں نظر سے گرا چکا ہے
وہ دل تلک بھی سفر کرے گا
نظر نظر سے ملا چکا ہے
وفا کی اُس کو نہیں ضرورت
وہ اپنا چہرہ دکھا چکا ہے
کسی کو اُس کی سمجھ نہ آئی
سنانے والا سنا چکا ہے
ہماری ساگر قدر کرے گا
اگر ہمیں آزما چکا ہے

صدام ساگر انصاری/ گوجرانوالہ

اپنے آنسو چھپا رہا ہوں میں
خود کو پتھر بنا رہا ہوں میں
صبر جتنا بڑھا رہا ہوں میں
زخم اُتنے مٹا رہا ہوں میں
آئینہ اپنے تلخ ماضی کا
حال کو پھر دکھا رہا ہوں میں
زخم کھا کے بھی مسکراتے ہوئے
زندگی کو لبھا رہا ہوں میں
اور تو کچھ نہیں میں مر کے اُسے
پیار اپنا دکھا رہا ہوں میں
اک شجر کو ہی اب کے روتے ہوئے
حال دل کا سنا رہا ہوں میں
ایک ہلکی سی روشنی کے لیے
اس کا ہر خط جلا رہا ہوں میں
سخت مشکل میں ہوں اسی لیے راجؔ
دوست خود کو بنا رہا ہوں میں

رئیس راج/ ملتان

سخن میں کیسے آئے گی لطافت
طبیعت میں نہیں ہے گر نفاست
خیالوں کا بہت خرچہ کیا ہے
سخن بنتا نہیں ایسے حقیقت
وہ شاعر منفرد ہوتا ہے سب سے
جسے ندرت عطا کرتی ہے قدرت
وہ ہر صورت مجھے پھر ڈھونڈ لیں گے
جنھیں ہوگی اگر میری ضرورت
سزا خود مانگتا ہے عشق جس سے
لگی ہے حسن کی ایسی عدالت
کثافت رینگتی ہے اس زمیں پر
اُڑاتی ہے بلندی پر لطافت
مخالف چل پڑی کوئی ہوا جب
بھری قدرت نے مجھ میں کیسی طاقت

شاعری (غزل، نظم)

یہاں ملتا ہے اُن کو حسن فرخ
جنھیں حسن عمل سے ہے محبت

فرخ محمود/لاہور

میں اک بہتا دریا ہوں
اپنی حد میں بہتا ہوں
"میں بھی تیرے جیسا ہوں"
میں کب ایسا کہتا ہوں
جاگ اُٹھتا ہے میرا درد
جب میں گم سُم ہوتا ہوں
تاکہ اُس سے کھاؤں مات
اُلٹی چالیں چلتا ہوں
بچوں کا بھر جائے پیٹ
بھوکا خود رہ لیتا ہوں
بچے گن کر خرچہ دیں
مجبوری سے لیتا ہوں
کس کو بھاؤں گا میں نازؔ

نازاوکاڑوی/لاہور

ذرا اک بار مُسکا دو بڑی گہری اُداسی ہے
ہمارے دل کو بہلا دو بڑی گہری اُداسی ہے
پرانے گھاؤ سارے درد سے مانوس لگتے ہیں
نیا اک زخم گہرا دو بڑی گہری اُداسی ہے
اکیلے پن نے اپنی ساری خوشیاں چھین رکھی ہیں
کبھی شانوں کو سہلا دو بڑی گہری اُداسی ہے
تمہا را عکس یادوں میں کہیں دھندلا نہ ہو جائے
کسی دن خواب مہکا دو بڑی گہری اُداسی ہے
خزا ں چہرہ گھٹاؤں کو ترستا ہے کبھی اس پر
گھنی زلفوں کو بکھرا دو بڑی گہری اُداسی ہے
جو پچھلے سال خط کے ساتھ بھیجا تھا اُسی جیسا
کوئی تحفہ انوکھا دو بڑی گہری اُداسی ہے

عامر بن علی/جاپان

یہ دل ہی تھا جو سپنے دیکھتا ہے
بھلا اب ٹوٹنے پر کیا گلہ ہے
بچھڑ جانا اگرچہ طے شدہ تھا
ترے جانے کا پھر بھی دکھ بڑا ہے
زمانے کے سبھی غم دے کے مجھ کو
مجھے وہ پوچھتا ہے، کیا ہوا ہے؟
کہیں ساون کی رم جھم میں اُداسی
کبھی من جس موسم پوجتا ہے
نہیں بدلے ہیں روزوشب ذرا بھی
وہی آوارگی کا سلسلہ ہے
ستم سہہ کر زباں سے کچھ نہ کہہ کر
جو زندہ ہیں انہی کا حوصلہ ہے
یہ چاہت ایسی وادی ہے جنوں کی
یہاں جو آ گیا وہ کب گیا ہے
محبت ان دنوں ارزاں ہوئی ہے
مجھے یہ عشق تو مہنگا پڑا ہے

عامر بن علی/جاپان

کاش

کاش اس طرح ہوتا
راستے بدلنے سے
منزلیں بدل جاتیں
آس کے درختوں پر
ناسمجھ پرندوں کے
پھر سے لوٹ آنے کی
خواہشیں بھی جل جاتیں

صائمہ اسحاق/کراچی

اُس کی محبت عجیب ہے
اُس کے تقاضے حیران کن
ابھی کل ہی اُس نے
مجھ سے کہا تھا
کہ
یہ اتنی بڑی بڑی بالیاں
کانوں میں نہ پہنا کرو
کہ مجھے برا سا لگتا ہے
جب تم بات کرتے ہوئے
اپنا سر ہلاتی ہو

شاعری (غزل، نظم)

تمہارے گالوں کو چھو جاتی ہیں
یہ آنکھوں کو خیرہ کرتی شوخ رنگ
تتلیاں
کہ دل ونظر جن کا پہلا شکار
جو اک پھول سے اُڑیں تو
دوسرے پہ
جا بیٹھیں
ان رنگ برنگی شوخ تتلیوں میں
گھرے کبھی تم نے سوچا
محبت کا یہ رنگ عارضی اور کچا ہے
تتلی کا پیار کتنا سچا ہے

شازیہ محسن/ خانیوال

محبت

محبت ایسا سچ ہے
جو ہمیشہ سے ہے دنیا میں
مگر پھر بھی پرانا ہو نہیں سکتا
کہ ہر اک چاہنے والے کی چاہت اک نیا سچ ہے
محبت ایسا رستہ ہے
جو قائم ہے ازل سے
پر اس کے سب مسافر
ہر قدم پر
ابھی تک تازگی محسوس کرتے ہیں
محبت ایسا سورج ہے
کہ جس کی ہر کرن دھرتی پہ پہلی بار اتری ہے

محبت جادوئی سا جذبہ
کہ جب من میں اترتا ہے
تو دھڑکن وہ نہیں رہتی
یہ دل ایسے بدلتا ہے
عجب ہی معجزہ دیکھا
زمانے میں محبت کا

عامر بن علی/ جاپان

کیا مثال دوں تمہاری؟

سپنے
خوشبو
یادیں
رنگ اور روشنیاں
سندر ہیں!!
پر تیرے جیسا روپ کہاں

عامر بن علی/ جاپان

دستورِ زمانہ

ہنسنے والے اچھے ہیں
ہنسنے والوں کے ہمراہ
دنیا والے ہنستے ہیں
رونے والے تنہا ہیں
تنہا تنہا روتے ہیں
ناحق پیار کی دھرتی میں
اپنے آنسو بوتے ہیں
جو چاہو وہ کر لو تم
دنیا والے دوست تمہارے
تم کو اپنی جان سے پیارے
لیکن ایسا ہونا ہے
کل تم کو بھی رونا ہے
اور پھر تنہا ہونا ہے

عامر بن علی/ جاپان

پارس

تیرا عشق وہ پارس پتھر
جس نے
مجھ سے بے وقعت کو
سونے میں تبدیل کیا تھا
لیکن یہ تو آدھا سچ ہے!
سارا سچ جو سننا چاہو
تم بھی پارس جیسی ہی ہو
پارس بھی تو پتھر ہی ہے
اوروں کو سونا کرتا ہے
خود لیکن پتھر رہتا ہے

عامر بن علی/ جاپان

بشیر رحمانی

جب سے میں سہہ رہا ہوں زمانے کا ہر ستم
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر جاگتی نہیں

تنہائیوں کی شب میں کہیں روشنی نہیں
شاید مرے نصیب میں آسودگی نہیں
اب رہروانِ شوق پہ کیا جانے کیا بنے؟
فقدانِ رہبری ہے، کہیں رہبری نہیں
ساحل سے بے نیاز جو طوفان میں رہے
کشتی وہ تیرتی ہے، کبھی ڈوبتی نہیں
اس میں تو لحظہ لحظہ ہے غارت گرِ حیات
جو ہم جلیسِ زیست ہو، یہ وہ صدی نہیں
جو آدمی کو راحت و آرام دے سکے
ایسا ہجومِ غم میں کوئی آدمی نہیں
ہر شخص بے نیاز ہے، سجدوں کے فرض سے
وہ بندہ کیا ہے جس کو غمِ بندگی نہیں
ساغر سے میکشوں کے جھلکتی ہے تشنگی
اس میکدے میں کیسے کہوں تشنگی نہیں
محفل میں چل چلاؤ کے ٹھہریں گے کس طرح
اس عارضی دیار میں کچھ سرسری نہیں
غیروں کا التفات پہ کیسے ہو اعتماد
اب اپنی ذات سے بھی مری دوستی نہیں
جب سے میں سہہ رہا ہوں زمانے کا ہر ستم
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر جاگتی نہیں
غیروں کے التفات پہ کب اعتماد ہو؟
اب اپنی ذات سے بھی مری دوستی نہیں
شاید میرا جنونِ تمنا ابھی ہے خام
سر میں بشیر میری ابھی کیا خودی نہیں

خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
ستم گر کے لیکن ستم دیکھتے ہیں
منڈیروں پہ آتے ہیں جب وہ ہماری
"خراماں خراماں ارم دیکھتے ہیں"
تکبر کی پوشاک ہے جن کے تن پر
شکستہ دلوں کو وہ کم دیکھتے ہیں
وہ جب جھانکتے ہیں دریچے سے اپنے
وہ ہر شے کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں
جو لگتا ہے میلہ کبھی رفتگاں کا
خدا جانے کس کس کو ہم دیکھتے ہیں
نگاہوں کو ڈستا ہے دل سوز منظر
جو صحنِ حرم میں صنم دیکھتے ہیں
نکلتے ہیں جب گھر سے راہِ طلب میں
بہر گام رنج و الم دیکھتے ہیں
ستم یاد آتے ہیں سب دوستوں کے
جب آنکھوں میں اُن کی کرم دیکھتے ہیں
گریزاں گریزاں نگاہوں سے اکثر
وہ میری وفا کا بھرم دیکھتے ہیں
بشیر آنکھ روتی ہے غم کا سمندر
جو حالاتِ اہلِ قلم دیکھتے ہیں

فضا میں اس قدر آلودگی ہے
غبار اوڑھے ہوئے ہر آدمی ہے
مشامِ آرزو کیوں کر نہ مہکے
تری خوشبو گلستاں میں رچی ہے
ابھی ابرِ کرم کی ہے ضرورت
ابھی تو گرد شیشوں پر جمی ہے
یہ مانا رات ہے ظلمت بداماں
نجومِ زندگی سے روشنی ہے
بہارِ نو سے ہے محروم گلشن
لہو پہنے ہوئے تازہ صدی ہے
مسافر ہیں گریزاں رہزنوں سے
خدا جانے کہاں اب رہبری ہے
محبت ہوگئی بے تاب دل میں
تری آواز جب میں نے سنی ہے
پس کردن بھی یہ زندہ رہوں گا
مجھے حاصل حیاتِ سرمدی ہے

بہاروں میں خزاں کا سامنا ہے
لہو پہنے ہوئے مہر و وفا ہے
یہ اعزاز پس کردن ہوا ہے
فنا کے بعد فردوسِ بقا ہے
محبت ہوگئی ہے جن کو تم سے
عقابِ آگہی بن کر اُڑا ہے
کبھی نازاں تھی جس پر رہنما
وہی فٹ پاتھ پر گرنے لگا ہے
یہ ہے آسیب کوئی یا مرا دل
پسِ دیوار کوئی بولتا ہے
گزرنی ہے ابھی جو اور مجھ پر
وہ ماتھے کی لکیروں میں لکھا ہے
فلک کی سیڑھیوں سے کون اُتر کر
نیا پیغام مجھ کو دے گیا ہے
ہزاروں غم ہیں میرے اک دل میں
یہ جینا میرے جینے کی سزا ہے

ممتاز اطہر

اب تو اپنی بھی خبر ہم کو نہیں ہے اطہرؔ · ہم کبھی واقفِ اسرار ہوا کرتے تھے

جن دنوں عشق تھا، آزار ہوا کرتے تھے
ہم کسی ہجر میں سرشار ہوا کرتے تھے
دھوپ جب شہر پہ ناراض ہوا کرتی تھی
ہم تری راہ میں چھتنار ہوا کرتے تھے
جس جگہ تم کو سنورنے کی طلب ہوتی تھی
ہم وہاں آئنہ بردار ہوا کرتے تھے
وہ جو اک شام سرِ آب شفق ملتی تھی
ہم اُسی شام سے گلنار ہوا کرتے تھے
جو پرندے میری شاخوں میں بسا کرتے تھے
وہ ترے لمس کا اظہار ہوا کرتے تھے
ابتدا ہی سے ان آنکھوں پہ ستم ہوتا تھا
خواب اُس وقت بھی مسمار ہوا کرتے تھے
یہ جہاں خاک سی اُڑتی ہوئی تم دیکھتے ہو
اس جگہ کوچہ و بازار ہوا کرتے تھے
اب تو اپنی بھی خبر ہم کو نہیں ہے اطہرؔ
ہم کبھی واقفِ اسرار ہوا کرتے تھے

میں نہ ہونی میں ہونے کے گماں تک ہوں
جہاں تک تم مجھے سوچو وہاں تک ہوں
ابھی مجھ کو میری اک شکل ملنی ہے
ابھی میں کوچۂ کوزہ گراں تک ہوں
تم اپنے تشنہ لب لمحے ادھر لاؤ
میں صحرا ہوں مگر آبِ رواں تک ہوں
پڑا ہوں خاک پر لیکن تری خاطر
دعا کا حرف ہوں اور آسماں تک ہوں
پھر اُس کے بعد جانے میں کدھر جاؤں
ترے ہمراہ تیری داستاں تک ہوں
کبھی نکلوں گا اس حیرت سرا سے میں
کسی دن خود کو دیکھوں گا کہاں تک ہوں
وہ اپنی ذات میں اطہرؔ مجھے ڈھونڈے
میں اپنی بے نشانی سے نشاں تک ہوں

تیرے ہونٹوں سے جب ادا ہوا ہوں
میں ہر اک سمت رونما ہوا ہوں
لوگ پتھر بنے ہوئے ہیں جہاں
میں وہاں آئینہ بنا ہوا ہوں
شام پانی میں بہہ رہی ہے جہاں
میں ترے دھیان میں رُکا ہوا ہوں
مجھ کو تو کس طرح جدا کرے گا؟
میں تری ذات میں کُھلا ہوا ہوں
اے مکاں کیا یہاں جلوں گا نہیں؟
در سے میں طاق پر دھرا ہوا ہوں
خود پہ اطہرؔ نہ کیوں کُھلا کبھی میں
یہ میں کس بھید سے بھرا ہوا ہوں

اپنی آنکھوں میں جو سیلاب لیے پھرتے ہیں
دل میں اک آتشِ بےخواب لیے پھرتے ہیں
کوئی موسم ہو ترے چاہنے والے ہر پل
دل کے ہر زخم کو شاداب لیے پھرتے ہیں
یہ کوئی پیرویِ قیس نہیں ہے صاحب
مجھ کو صحرا میں مرے خواب لیے پھرتے ہیں
شہر کا شہر تعاقب میں ہمارے کیوں ہے؟
ہم کوئی گوہر نایاب لیے پھرتے ہیں؟
فکرِ عکس جھلکا تھا جہاں پانی میں
ہم تصوّر میں وہ تالاب لیے پھرتے ہیں
تم کسی روز ہمیں شام سے پہلے ملنا
اک سخن ہم بھی جہاں تاب لیے پھرتے ہیں
یہ جو دنیا ہے مجھے خوش نہیں آتی اطہرؔ
مجھ کو اس جا مرے احباب لیے پھرتے ہیں

کویت میں مقیم اُردو کے معروف شاعر
طارق محمود طارق
کا اوّلین شعری مجموعہ
فقط مجھ پہ عیاں ہوتا ہے
مکتبہ فجر کے زیرِ اہتمام شائع ہو گیا ہے
ملنے کا پتہ: مکتبہ فجر، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

لبنیٰ صفدر/ حافظ آباد

ذرا سا راستہ دے زندگی بھی　　یہاں ہر دائرے میں دائرہ ہے

لبنیٰ صفدر کی شاعری ادبی دنیا میں خاصی تیز رفتاری سے اعتبار حاصل کر رہی ہے۔ اس غزل کے نمایاں ترین رنگ سفر اور محبت ہیں۔ یہاں سفر محبت میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے اور محبت بالآخر ایک طویل مسافت کا روپ اختیار کرنے لگتی ہے اور حیرت انگیز طور پر شاعرہ کو دونوں سے نباہ کرنے کا ہنر آتا ہے۔ جدید غزل میں جمال پسندی حالت پسپائیت میں نظر آتی ہے۔ مگر لبنیٰ کی غزل ذہنی، جسمانی اور عرضی حسن کے لیے اپنا دامن وا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس غزل کی شاعرہ کو نہ صرف اپنے عورت ہونے کا پوری طرح ادراک ہے بلکہ وہ تیسری دنیا کی پس ماندہ عورت کے استحصال کے خلاف ایک مضبوط آواز بنتی نظر آتی ہے۔ لبنیٰ صفدر برصغیر میں غزل کی مختصر سی نسائی کہکشاں کا ایک ایسا روشن ستارہ ہے جو اس آسمان کو تادیر روشن رکھے گا۔ (ڈاکٹر جواز جعفری)

کوئی شجر بھی نہ دیوار ہے شناسا بھی
لرزتی بیل کو تھوڑا ملے سہارا بھی
یہ آگ جس نے جلائی وجود و دل میں مرے
یقیں دلاتا تو کرتی میں اُس کو سجدہ بھی
لکھا تھا نام مرا پھر بھی بے وفاؤں میں
میں ہیر بھی تھی، میں سوہنی بھی اور لیلیٰ بھی
اُسی کے خواب کا کاجل تھا میری آنکھوں میں
حنا سے نام ہتھیلی پہ اُس کا لکھا بھی
مری گواہی تو پہلے بھی نصف تھی، سو تھی
ملا نہیں میرے حصے کا مجھ کو آدھا بھی
بہت سنبھال کے جس نے رکھا ہوا تھا مجھے
وہ دیکھتا کبھی لبنیٰ میرا بکھرنا بھی

وہ جس سے بس ذرا سا واسطہ ہے
مجھے کمزور کرنے میں لگا ہے
ذرا سا راستہ دے زندگی بھی
یہاں ہر دائرے میں دائرہ ہے

تعلق میں دراڑیں پڑ گئی ہیں
ہمارے درمیاں اک تیسرا ہے
تمہیں تو لفظ سننے کی ہے عادت
پڑھو اس آنکھ میں بھی کچھ لکھا ہے
مسلسل گھنٹیاں سی بج رہی ہیں
سنہرا دن گزرتا جا رہا ہے
بہت جلنے لگی ہیں میری آنکھیں
تمہاری یاد ہے اور رت جگا ہے
وہ جس دن ملا ہے مجھ سے لبنیٰ
ستارہ مجھ میں لو دینے لگا ہے

درمیاں پردہ نہ پھر کوئی بھی حائل رکھا
اس طرح چاہا اُسے خون میں شامل رکھا
اک اشارہ تھا کسی آنکھ کا رستے جیسا
ایک چہرہ تھا جسے حاصل منزل رکھا
جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا
نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا

اُس نے کشکول مرے ہاتھ کو بننے نہ دیا
ایک در کا میرے رب نے مجھے سائل رکھا
ایک ہی خواب دریچہ تھا جہاں پر لبنیٰ
اپنی آنکھیں بھی وہیں رکھیں وہیں دل رکھا

ہوائے ہجر میں خود کو غبار کرتے ہوئے
بکھر رہی ہوں ترا انتظار کرتے ہوئے
یہ اپنے نام کے ہجے بھی ہم کو بھول گئے
تری انا کو ذرا باوقار کرتے ہوئے
تمہارا نام ستاروں پہ لکھتی رہتی تھی
یہ عمر کاٹ دی تارے شمار کرتے ہوئے
کسی کنارے پہ کوئی بھی منتظر نہ ملا
ہر ایک بار یہ دریا کو پار کرتے ہوئے
میں مطمئن کہ صداؤں سے بھر گیا آنگن
اکیلے ایک پرندے کو ڈار کرتے ہوئے
کبھی تو لبنیٰ یہ چاہوں کہ کھلکھلائے ہنسوں
خود اپنے آپ کو یوں سوگوار کرتے ہوئے

حرا رانا/لاہور

عجب سلسلہ ہے نمازِ محبت　　قضا کر کے روئے، ادا کر کے روئے

حرا رانا کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے وہ گزشتہ دو دہائیوں سے شعروادب سے وابستہ ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''اگلا موڑ جدائی ہے'' کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔ جس کے اب تک دو ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ وہ پاکستان میں ہونے والے متعدد عالمی اور ملکی مشاعروں میں شریک ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دبئی میں ہونے والے عالمی مشاعرے میں پاکستان کی نمائندگی کر چکی ہیں۔ حرا رانا کی شاعری سے متعلق عطاء الحق قاسمی یوں رقم طراز ہیں: ''حرا کی شاعری اور شخصیت دونوں کو جو پہلو سب سے پہلے آپ کے سامنے آتا ہے وہ سنجیدگی ہے۔ زندگی کے بارے میں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں حرا جذباتی ہوتے ہوئے بھی ایک سنجیدہ رویہ رکھتی ہے۔ یہی اُس کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔''

لہر دریا سے اُٹھانے میں بہت دیر لگی
پاؤں پانی پہ جمانے میں بہت دیر لگی
پھر سے محسوس ہوئی تیری کمی شدت سے
آج بھی دل کو منانے میں بہت دیر لگی
یوں تو ہر نقش روانی سے بنایا اس کا
صرف آنکھوں کو بنانے میں بہت دیر لگی
لے گئی نیند مجھے خواب جزیرے پہ کہیں
اس لیے لوٹ کے آنے میں بہت دیر لگی
کپکپاتے تھے مرے ہونٹ، برستی آنکھیں
مختصر بات بتانے میں بہت دیر لگی
دستکیں دیتی رہی نیند مری پلکوں پر
آج بچوں کو سُلانے میں بہت دیر لگی
یاد کرنے پہ بھی اب یاد نہیں آتے حرا
وہ کبھی جن کو بھلانے میں بہت دیر لگی

کاغذ پہ ایک نام اُتارا تھا، اور بس
پھر ہم تھے یا قبیلہ ہمارا تھا، اور بس
ماتھے پہ اس کا لمس تھا ہاتھوں میں اک گلاب
دشوار زندگی کا اشارہ تھا، اور بس
منظر تھا ڈوبتے ہوئے سورج کا اور میں
دریا میں ایک عکس تمہارا تھا، اور بس
ہم تھے کہ پاگلوں کی طرح بھاگتے رہے
اس کی طرح کسی نے پکارا تھا، اور بس
دل میں تمہاری یاد، اماوس کی رات تھی
ہمراہ میرے ایک ستارہ تھا، اور بس
پھر اس کے بعد راستہ خوشبو میں کٹ گیا
کچھ وقت اس کے ساتھ گزارا تھا، اور بس
وہ مضطرب تھا عشق میں نقصان کچھ نہ ہو
ہم مطمئن کہ جاں کا خسارا تھا اور بس
پلکوں پہ کوئی خواب سجایا نہیں حرا
نیندوں پہ رتجگوں کا اجارہ تھا، اور بس

دل کے بدلے ہوئے حالات سے ڈر لگتا ہے
پھر قبیلے کی روایات سے ڈر لگتا ہے
بات کرتی ہوں مگر بات نہیں ہو پاتی
جانے کیا بات ہے کس بات سے ڈر لگتا ہے
بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی
زندگی تیرے سوالات سے ڈر لگتا ہے
اس کی گلیوں میں یونہی جانا یونہی لوٹ آنا
دلِ ناداں تیری حرکات سے ڈر لگتا ہے
آسماں چھوتی ہوں جب اُس کی نظر ہو مجھ پر
عشق میں ایسی کرامات سے ڈر لگتا ہے
چین اک پل بھی کہاں آتا ہے تم بن اے دوست
بس زمانے کی خرافات سے ڈر لگتا ہے
خامشی، ہجر، اندھیرا، غمِ تنہائی، حرا
مختصر یہ کہ مجھے رات سے ڈر لگتا ہے

آس کے کتنے ستاروں کو بجھا کر آئی
رات آئی تو کئی درد جگا کر آئی
صرف اک تیرہ شبی کا ہی گلہ کیا کرتے
اشک پلکوں پہ ہر اک صبح سجا کر آئی
ڈھونڈنے آئے مجھے میرا قبیلہ شاید
راہ میں اس لیے میں دیپ جلا کر آئی
آتے آتے اُسے کچھ دیر پلٹ کر دیکھا
میں جدائی کی ہر اک رسم نبھا کر آئی
گھر سے نکلی تو کئی کانٹوں نے آنچل کھینچا
کتنی مشکل سے میں آنچل کو بچا کر آئی
تیری خوشبو سے مری جان پہ بن آتی ہے
اے صبا! آج گلے کس کو لگا کر آئی
چاہے جس راہ سے آئے وہ مرے گھر میں حرا
میں ہر اک راہ میں پھولوں کو بچھا کر آئی

جواد شیخ/اوسلو

خدا کے بارے میں اک دن ضرور سوچیں گے
ابھی تو خود سے تعلق بھی اُستوار نہیں

مرے حواس پہ حاوی رہی کوئی کوئی بات
کہ زندگی سے سوا خاص تھی کوئی کوئی بات
یہ اور بات کہ محسوس تک نہ ہونے دوں
جکڑ سی لیتی ہے دل کو تری کوئی کوئی بات
کوئی بھی تجھ سا مجھے ہو بہو کہیں نہ ملا
کسی کسی میں اگرچہ ملی کوئی کوئی بات
خوشی ہوئی کہ ملاقات رائیگاں نہ گئی
اُسے بھی میری طرح یاد تھی کوئی کوئی بات
بدن میں زہر کے مانند پھیل جاتی ہے
دلوں میں خوف سے سہمی ہوئی کوئی کوئی بات
کبھی سمجھ نہیں پائے کہ اُس میں کیا ہے مگر
چلی تو ایسے کہ بس چل پڑی کوئی کوئی بات
وضاحتوں میں اُلجھ کر یہی کُھلا جواؔد
ضروری ہے کہ رہے اَن کہی کوئی کوئی بات

کوئی اتنا پیارا کیسے ہو سکتا ہے؟
پھر سارے کا سارا کیسے ہو سکتا ہے؟
تُجھ سے جب مل کر بھی اُداسی کم نہیں ہوتی
تیرے بغیر گزارا کیسے ہو سکتا ہے؟
کیسے کسی کی یاد ہمیں زندہ رکھتی ہے؟
ایک خیال سہارا کیسے ہو سکتا ہے؟
یار ہوا سے کیسے آگ بھڑک اُٹھتی ہے؟
لفظ کوئی انگارا کیسے ہو سکتا ہے؟
کون زمانے بھر کی ٹھوکریں کھا کر خوش ہے؟
درد کسی کو پیارا کیسے ہو سکتا ہے؟
ہم بھی کیسے ایک ہی شخص کے ہو کر رہ جائیں؟
وہ بھی صرف ہمارا کیسے ہو سکتا ہے؟
کیسے ہو سکتا ہے جو کچھ بھی میں چاہوں؟
بول نا میرے یارا کیسے ہو سکتا ہے؟

کرے گا کیا کوئی میرے گلے سڑے آنسو
تو کیوں نہ سوکھ ہی جائیں پڑے پڑے آنسو
جو یاد آئیں تو دِل غم سے پھٹنے لگتا ہے
کسی عزیز کی پلکوں میں وہ جڑے آنسو
ہُوا میں اپنی تہی دامنی سے شرمندہ
کسی کی آنکھوں میں تھے یہ بڑے بڑے آنسو
خزاں میں پتے بھی ایسے کہاں جھڑے ہوں گے
ہماری آنکھوں سے جُوں ہجر میں جھڑے آنسو
میں اِس خیال سے جاتے ہوئے اُسے نہ مِلا
کہ روک لیں نہ کہیں سامنے کھڑے آنسو
کسی نے ایک طرف مَر کے بھی گِلہ نہ کِیا
کسی نے دیکھتے ہی دیکھتے گھڑے آنسو
مہارت ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ
نکالتا ہے کوئی یوں کھڑے کھڑے آنسو
تمھیں کہا نا کہ بس ہو گئے جدا ہم لوگ
اُکھاڑتے ہو میاں کس لیے گڑے آنسو
مگر جو ضبط نے طوفاں کھڑے کیے اب کے!!
تمام عمر بہایا کیے بڑے آنسو
عجب گداز طبیعت ہے آپ کی جواؔد
ذرا سی بات ہوئی اور چھلک پڑے آنسو

غمِ جہاں سے میں اُکتا گیا تو کیا ہو گا ؟
خودَ اپنی فکر میں گھلنے لگا تو کیا ہو گا؟
یہ ناگزیر ہے اُمید کی نمو کے لیے
گزرتا وقت کہیں تھم گیا تو کیا ہو گا؟
یہی بہت ہے کہ ہم کو سکوں سے جینے دے
کسی کے ہاتھوں ہمارا بھلا تو کیا ہو گا
یہ لوگ میری خموشی پہ مُجھ سے نالاں ہیں
کوئی یہ پوچھے میں گویا ہوا تو کیا ہو گا
میں اِس لیے بھی بہت مختلف ہوں لوگوں سے
وہ سوچتے ہیں کہ ایسا ہوا تو کیا ہو گا
جنوں کی راہ عجب ہے کہ پاؤں دھرنے کو
زمین تک بھی نہیں نقشِ پا تو کیا ہو گا
یہ ایک خوف بھی میری خوشی میں شامل ہے
ترا بھی دھیان اگر ہٹ گیا تو کیا ہوگا
جو ہو رہا ہے وہ ہوتا چلا گیا تو پھر؟
جو ہونے کو ہے وہی ہو گیا تو کیا ہو گا ؟

اِدھر یہ حال کہ چھونے کا اختیار نہیں
اُدھر وہ حُسن کہ آنکھوں پہ اعتبار نہیں
میں اب کسی کی بھی اُمید توڑ سکتا ہوں
مجھے کسی پہ بھی اب کوئی اعتبار نہیں
تم اپنی حالتِ غربت کا غم مناتے ہو
خدا کا شکر کرو مجھ سے بے دیار نہیں
میں سوچتا ہوں کہ وہ بھی دُکھی نہ ہو جائے
یہ داستان کوئی ایسی خوشگوار نہیں
تو کیا یقین دلانے سے مان جاؤ گے ؟
یقیں دلاؤں کہ یہ ہجر دل پہ بار نہیں
قدم قدم پہ نئی ٹھوکریں ہیں راہوں میں
دیارِ عشق میں کوئی بھی کامگار نہیں
یہی سکون مری بے کلی نہ بن جائے
کہ زندگی میں کوئی وجہِ انتظار نہیں
خدا کے بارے میں اِک دن ضرور سوچیں گے
ابھی تو خود سے تعلق بھی اُستوار نہیں
گلہ تو مجھ سے وہ کرتا ہے اس طرح جواؔد
کہ جیسے میں تو جدائی میں سوگوار نہیں

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیے
بچے نے تو ایک ہی پیسہ مانگا تھا

اس کے بعد اقبال صلاح الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی شفقت اور مہربانی کا ثبوت دیا اور مجھے مجموعہ کلام ترتیب دینے پر آمادہ کیا۔ مجموعے کی ترتیب و تزئین میں پروفیسر ابو اعجاز اور حفیظ صدیق نے بہت معاونت کی۔ اس طرح اقبال صلاح الدین صاحب کی توسط سے میرا پہلا مجموعہ ''نخلِ جاں'' کے نام سے سامنے آیا۔ 1981ء میں لاہور آ گیا۔ یہاں مکتبہ تعمیر انسانیت کے سعید اللہ صدیق صاحب سے سعد اللہ شاہ صاحب نے متعارف کرایا۔ سعید صاحب بہت مہربان ثابت ہوئے۔ میرے باقی مجموعے انہوں نے ہی شائع کیے ہیں۔

ارژنگ: اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

اسلم کولسری: اب تک میرے سات شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ ان میں چھ اُردو اور ایک پنجابی میں ہے۔ جن کے نام بالترتیب یوں ہیں:
نخلِ جاں، کاش، ویرانہ، پنچھی (پنجابی) نیند، جیون اور برسات

اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اکرم چغتائی کے توسط سے آسٹریا کی جدید شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ جو ''ایک نظر کافی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لیکن روزنامہ مشرق میں ''روشنیوں سے دور'' کے عنوان سے کالم لکھتا رہا ہوں۔

ارژنگ: کبھی ٹی وی ڈرامے فلمی کہانیاں یا گیت وغیرہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

اسلم کولسری: سوچتا تو ہوں لیکن یہ فلم اور ٹی وی کا راستہ مجھے بہت دُشوار نظر آتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کا جو ایک خاص انداز ہے وہ مجھے نہیں آتا۔ کبھی اتفاق ہوا تو ضرور کوشش کروں گا۔ جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے تو ریڈیو، ٹیلی ویژن کے لیے میں نے گیت لکھے ہیں لیکن فلم سے رابطے کا اتفاق نہیں ہوا۔ موقع ملا تو ضرور لکھوں گا بلکہ میری خواہش ہے کہ کوئی اچھی ٹیم ملے تو میں فلم کے گیت اور کہانی لکھوں۔

ارژنگ: اب تک آپ کو کسی کتاب پر ایوارڈ ملا اور اگر نہیں تو اس کی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

اسلم کولسری: ابھی تک مجھے کسی کتاب پر ایوارڈ نہیں ملا۔ شاید اس لیے کہ ان میں سے کوئی کتاب ایوارڈ کے قابل نہیں ہوگی۔

ارژنگ: ہمارے ناقدین ادب انصاف سے کام لیتے ہیں؟

اسلم کولسری: میرے خیال میں تو انصاف سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہماری فطرت میں وضع داری بھی ہے۔ اس لیے لحاظ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

ارژنگ: دیباچہ اور فلیپ نگاری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

اسلم کولسری: دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں صرف کتاب کی خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مثبت رائے ہی بھلی لگتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کتاب کا دیباچہ نگار یہ لکھے کہ کتاب پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔

ارژنگ: موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار رہ گیا ہے؟

اسلم کولسری: مشاعرے ہونے چاہئیں تاکہ سامعین اور ناظرین کو تھیٹر ڈرامے اور کھیل کے علاوہ بھی کچھ تو میسر ہو۔ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ دوسری تینوں چیزیں تھیٹر ڈرامہ اور کھیل اس قدر غائب ہو گئے ہیں کہ مشاعروں میں سامعین تھیٹریکل موڈ لے کر آتے ہیں اور زیادہ تر ہوٹنگ انجوائے کرتے ہیں لیکن یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے اور بہتری کی اُمید رکھنی چاہیے۔ بیرونِ ملک مشاعروں کی فضا نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے پردیسیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ وطن سے آنے والوں کو سننے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک خالص دیسی تقریب ہوتی ہے جسے وہ پردیس میں خوب انجوائے کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ مشاعروں میں جو سیکھنے اور سکھانے کی روایت تھی باقی ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ مشاعرے کی روح اب سامعین کے دل و دماغ میں نہیں ہوتی نہ ان کا مقصد کوئی سیکھنے کا ہوتا ہے۔ وہ صرف ہوٹنگ کرنے آتے ہیں۔

ارژنگ: کسی شاعر کی کامیابی کا معیار مشاعروں میں اس کی مقبولیت کو قرار دیا جا سکتا ہے؟

اسلم کولسری: مشاعروں میں وہ لوگ بھی جاتے ہیں جو کسی اور حوالے سے مقبول ہوتے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ بیان کروں گا۔ قطر کے ایک مشاعرے میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو بہت داد ملی۔ مشاعرے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں ادبی ایڈیشنوں کی وجہ سے مشاعروں میں بلایا جاتا ہے۔ ایسا نہیں آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے مجھے کتنی محبت سے سنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ مختلف حوالوں سے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کسی کو میری کالم نگاری پسند ہے کسی کو میرے ڈرامے اچھے لگتے ہیں۔ اسی طرح وہ میری شاعری کو بھی پسند کرتے ہیں۔

ارژنگ: جدت پسندی کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے مطمئن ہیں؟

اسلم کولسری: جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن ہمیں سارے تجربات مسلمہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کرنے ہوں گے۔ تبھی وہ مقبول ہوں گے۔ جدت کے نام پر غزل میں ردیف کو پہلے، قافیہ کو درمیان میں رکھ دینا اس سے بات نہیں بنے گی۔

ارژنگ: ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب میں سے کس پر یقین رکھتے ہیں؟

اسلم کولسری: دونوں ضروری ہیں۔ ادب برائے اصلاح بھی اور ادب برائے ادب بھی۔ مگر ان میں تناسب ہونا ضروری ہے۔ ادب برائے ادب بھی ادب برائے زندگی ہے۔

ارژنگ: ہم عصر شعراء میں کون کون پسند ہے؟

اسلم کولسری: سبھی پسند ہیں اور سبھی بہت اچھا شعر کہتے ہیں۔ بزرگ بھی حق ادا کر رہے ہیں اور نوجوان بھی حیران کر رہے ہیں۔ ان میں میں شامل نہیں ہوں۔

ارژنگ: نامور ادیب ظفر اقبال کا تعلق بھی آپ کے شہر اوکاڑہ سے ہے۔ آپ ان کو بطور شاعر معتبر سمجھتے ہیں یا بطور کالم نگار؟

اسلم کولسری: میں تو ظفر اقبال کو بطور شاعر زیادہ معتبر سمجھتا ہوں لیکن ان کی کالم نگاری بھی اچھی ہے۔ جس طرح انہوں نے شاعری میں نئی سمتیں روشن کی ہیں وہی کوشش وہ کالم نگاری میں بھی کرتے ہیں لیکن اہمیت ان کی شاعری کو ہی حاصل ہے۔

ارژنگ: کس صنف ادب میں لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتے ہیں؟

اسلم کولسری: یوں تو سب کچھ لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتا ہوں۔ تاہم میں نے تیر کسی فن میں بھی نہیں مارا۔ اپنی سی جو کوشش کرتا ہوں وہ اگرچہ ناکام ہوتی ہے لیکن میرے لیے وہ دُشوار نہیں ہوتی اور یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ ناکامی البتہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہوں۔

ارژنگ: شعر کیوں کہتے ہیں؟

اسلم کولسری: قدرت نے یہ صلاحیت عطا کی بعد میں ایسا ماحول ملا کہ میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا گیا۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

ارژنگ: اگر یہ خداداد صلاحیت ہے تو پھر سینئر، جونیئر کا جھگڑا کیسا؟

اسلم کولسری: دیکھیں صلاحیت بھی تو کم یا زیادہ ہو سکتی ہے اور پھر اس میں انسان کی محنت اور ریاضت اس درجہ بندی کا باعث بنتی ہے۔

ارژنگ: شاعری میں ''محنت اور ریاضت'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کریں گے؟

اسلم کولسری: میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ بعض اوقات شعر کہنے کا موڈ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں کوئی کام یا مجبوری سامنے آ جاتی ہے۔ میں شاعری کے موڈ کا بیڑہ غرق کر کے اس کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ یہ میری غفلت ہے یا بے نیازی ہے۔ اگر ایسی کیفیت میں میں کام کو خواہ کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو نظر انداز کر کے اپنی اس کیفیت سے استفادہ کروں اور شاعری یا ذہن میں آئی ہوئی غزل کو مکمل کروں تو اسے محنت کہیں گے۔ میں ایک مدت سے ایسی کیفیت کو ہوا میں اُڑا رہا ہوں سو محنت نہیں کر رہا ہوں۔ جہاں تک ''ریاضت'' کا تعلق ہے اس میں مطالعہ شامل ہے۔ علم عروض پر مکمل دسترس حاصل کرنے کی کوشش شامل ہے اور میرے مرحوم دوست حسن رضا خان کا مشورہ شامل ہے کہ روزانہ شاعری کرو۔ بے شک وہ غزلیں پھاڑتے چلے جاؤ۔ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی آپ ایسی غزل کہنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے جس سے آپ مطمئن ہوں گے۔

ارژنگ: اور ان شعراء کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو روزانہ اس ریاضت سے تو گزرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ اب تک لاتعداد مجموعوں کے مصنف ہیں۔ مگر ان کی شاعری سے نہ تو قاری مطمئن ہے اور غالباً نہ وہ خود ہی مطمئن ہیں؟

اسلم کولسری: اگر وہ خود مطمئن نہ ہوتے تو کبھی بھی مجموعے شائع نہ کرتے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان سے کہیں زیادہ انہوں نے انتخاب کرتے وقت ضائع کر دیے ہوں۔

ارژنگ: غالباً آپ طنز کر رہے ہیں؟

اسلم کولسری: (مسکراتے ہوئے) ہرگز نہیں۔

ارژنگ: اب تک آپ کے جتنے بھی انٹرویوز چھپے ہیں ان میں آپ نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ایسا آپ مزاجاً کرتے ہیں یا احتیاطاً؟

اسلم کولسری: زیادہ مزاجاً کم احتیاطاً۔

ارژنگ: اس احتیاطاً کو ہم ''بزدلی'' بھی کہہ سکتے ہیں؟

اسلم کولسری: ضرور۔

ارژنگ: بے شک آخرت میں اس کا حساب دینا پڑے؟

اسلم کولسری: اللہ معاف کرنے والا ہے۔

ارژنگ: گویا آپ ایسے شعراء کے حوالے سے ڈنڈی مارنے کا اعتراف کر رہے ہیں؟

اسلم کولسری: اب مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی پڑے گی۔ دیکھیں ایک تو میری طبیعت میں لڑائی جھگڑا نہیں۔ دوسرا مجھے اس کا تجربہ بھی نہیں اور تیسری بات اگر آپ غور کریں جس شخص نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے اس نے کبھی نہ کبھی آپ کو سکھ بھی پہنچایا ہوگا۔ میں ارادتاً ان خوشگوار لمحوں کو اپنے ذہن میں ہمیشہ زندہ رکھتا ہوں۔ اس طرح دُکھ کی اذیت کم ہو جاتی ہے اور میں اس سطح پر نہیں آتا کہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاؤں۔ اس کیفیت کو میں نے ایک شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

ہم صورت ستم سہنا کسے مرغوب ہے لیکن
کوئی احسان کر دیتے وہ بیداد سے پہلے

ارژنگ: کیا شاعری میں بسیار گوئی شاعری کے معیار پر اثر انداز نہیں ہوتی؟

اسلم کولسری: نہیں میرے بھائی اچھا شاعر جتنا بھی زیادہ لکھے اچھا لکھے گا۔ جیسے مولانا روم اور علامہ اقبال اور کئی دوسرے شعرائے کرام اور کم تر صلاحیت والا شاعر ساری زندگی میں تین بھی شعر کہتے تو تینوں بیکار ہوں گے۔

ارژنگ: یہاں ''کئی دوسرے شعراء'' سے آپ کا اشارہ کن کی طرف ہے؟

اسلم کولسری: میں نے مولانا روم اور علامہ اقبال کا ذکر کر کے ان شعراء کی جانب اشارہ کر دیا ہے جو اس سطح کے ہیں۔

ارژنگ: کبھی نثر لکھنے کا خیال آیا؟

اسلم کولسری: میں نے لکھنے کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اور ایک انتہائی دردناک افسانہ لکھا۔ دردناک پر واویلا لگا لیجیے۔ اس وقت میرے واحد سامع اور میرے دوست سیّد ناصر تھے۔ ان کو سنایا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یاد رہے کہ انتہائی دردناک افسانہ تھا۔ چنانچہ میں نے افسانے کے اس دردناک انجام پر کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ شاعری کے سلسلے میں ایسا نہ ہو سکا بلکہ شاعری پر مجھے انہوں نے ہی اُکسایا تھا اور پہلی غزل پر خوب داد دی تھی لیکن سنجیدگی کے ساتھ۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ روزنامہ مشرق میں رہتے ہوئے کالم نگاری کی کوشش کی۔ کچھ لکھے وہ ''اینویں'' سے تھے۔ آج کل تو شاعری بھی بہت کم کم ہو رہی ہے۔

ارژنگ: اب تک آپ کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

اسلم کولسری: اب تک میرے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک پنجابی شعری مجموعہ ہے اور باقی سات اُردو مجموعے ہیں۔

ارژنگ: آٹھ مجموعوں کی اشاعت کے باوجود آج تک آپ نے کسی مجموعے کی تقریب رونمائی نہیں کی۔ خبر سننے میں نہیں آئی۔ حالانکہ آپ کے دوستوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے؟

اسلم کولسری: میں جب اوکاڑہ میں تھا تب میری پہلی کتاب ''نخلِ جاں'' شائع ہوئی تھی۔ اس کی تقریب لاہور میں ہوئی تھی اور اس کا اہتمام نعیم اظہر مرحوم، انور قمر اور یوسف مثالی نے کیا تھا۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ باقی کتابوں کی تقریب رونمائی نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے اس کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ ہاں البتہ پچھلے دنوں خبریں اور ادبی تنظیم ''روش'' کے زیرِ اہتمام میرے ساتھ ایک تقریب ہوئی جس کا اہتمام ممتاز نوجوان شاعر ثناء اللہ شاہ نے کیا۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس تقریب کے لیے مجبور کیا اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی پرخلوص کوششیں کیں اور آپ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ روزنامہ ''خبریں'' کے طاہر انجم اور عفت علوی نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں انتہائی جدوجہد کی۔

ارژنگ: اس تقریب میں ملک کے ممتاز نقاد خواجہ زکریا نے آپ کو عصرِ حاضر کے دس بہترین شعراء میں شمار کیا۔ آپ کے خیال میں باقی نو کون سے ہیں؟

اسلم کولسری: اصل میں جب کسی کے ساتھ تقریب منعقد کی جاتی ہے تو اس کی کارکردگی کی تعریف کی جاتی ہے۔ خامیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی میری حوصلہ افزائی کی جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

ارژنگ: کیا ایسا ممکن ہے کہ خواجہ صاحب جیسا سنجیدہ نقاد برسرِ عام اتنی بڑی رائے محض کسی کی عزت افزائی کے لیے دے دیں؟

اسلم کولسری: پھر میں عرض کروں گا کہ ایسی تقریب کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اس بات کو ان کی حتمی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔

ارژنگ: آپ اتنے مردم بیزار کیوں ہیں؟

اسلم کولسری: ایسی بات نہیں۔ میں فطری طور پر کم آمیز ضرور ہوں۔ خلوت کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔

ارژنگ: آپ لاہور جیسے شہر میں ایک عرصہ سے رہ رہے ہیں لیکن مزاجاً ابھی تک آپ اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکل سکے کیوں؟

اسلم کولسری: واقعی مجھے گاؤں بہت یاد آتا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اب اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ مجھے وہ آنگن بہت یاد آتا ہے جس میں میرے ماں باپ کے قدموں کے نشان ہوا کرتے تھے۔ وہ درخت بھی یاد آتے ہیں جن کے نیچے کھیلتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اور بھولی بہت یاد آتے ہیں۔ میں انہیں بھلا نہیں سکتا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں۔

ارژنگ: آپ کا ایک شعری مجموعہ ''کاش'' کے نام سے چھپا ہے۔ کسی حد تک آپ کی ساری شاعری اس ایک لفظ کے گرد گھومتی ہے۔ اس ''کاش'' کی وضاحت کریں گے؟

اسلم کولسری: کاش اپنی وضاحت خود ہے اور اس کی تفصیل میری شاعری میں بھی موجود ہے۔

ارژنگ: میں نے تفصیل کی نہیں محرک کی بات کی ہے؟

اسلم کولسری: اصل میں میں زندگی کو جس طرح بسر کرنا چاہتا تھا۔ ویسے نہیں کر پایا حالات بھی موافق نہیں تھے اور انتھک جدوجہد بھی نہ کر سکا۔ یوں کہیں:

سدا آنکھیں رہیں برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے پر
اچانک راستے پر کوئی دریا بھی نہیں آیا

حسن عباسی: اپنے علمی و ادبی کام کے حوالے سے کچھ بتائیں۔

ڈاکٹر کوثر محمود: ابھی تک شاعری کی صرف ایک کتاب، ''کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو'' اور موپاساں کی فرانسیسی کہانیوں کے اُردو تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ بعنوان ''موی گیند زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ باقی بہت سا کام ہے کہ جو ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ بہرحال پنجابی شاعری کا مجموعہ ''چوکھیا دیوا'' مکمل ہے اور اُردو شاعری کا مجموعہ ''صبح جمال کی پہلی ساعت'' وہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔ علاوہ ازیں ''اردو شاعری میں خوشبو کا استعارہ'' کے نام سے ایک ضخیم مقالہ اور ''میرے دوستوں کی نظمیں'' کے عنوان سے تنقیدی و توضیحی مضامین کی کتاب بھی تیار ہے دیکھئے کب چھپنے کی نوبت آتی ہے۔

حسن عباسی: آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: بھئی مجھے کسی نظریے کا تو نہیں پتہ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اُس نے جس سے جو کام لینا ہے بڑے سلیقے سے لے لیتا ہے اور جس کو پذیرائی دینی ہو اُسے مل بھی جاتی ہے۔ کسی سے عجلت کا معاملہ کرنا ہے کس کو وعدۂ فردا پہ رکھنا ہے؟ اس کی بھی اُسے ہی خبر ہے۔ ہمیں بس جو کام، جیسا بھی آتا ہے کرتے رہنا چاہیے۔

حسن عباسی: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چند افراد نے ادب کے ہوائی جہاز کو ہائی جیک کر لیا ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: اویسے مجھے بتائیں کہ ہوائی جہاز کو ہائیک جیک کرنے والے ہمیشہ اُسے اپنے زیر تصرف رکھ سکتے ہیں؟ اپنے وقتی مفادات کو پورا کرنے کے بعد وہ اس سے دستبردار ہو ہی جاتے ہیں اور سورج کو کتنی دیر چھپایا جا سکتا ہے؟ اس طرح کے لوگ ہر دور میں رہے ہیں۔ ان کا رویہ بالعموم ایک سا ہی ہوتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح دنیا کی تمام ایئر لائنز کے تمام جہاز ہائی جیک نہیں ہو سکتے صرف چند ایک کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے اسی طرح کچھ خوشامدی اور چاپلوس لوگ ان پڑھ اور کندۂ ناتراش حکام سے کچھ نہ کچھ اپنے استحقاق سے بڑھ کر لے مرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑی آسان سی پہچان ہے، یہ لوگ کسی سرکاری منصب کو اپنے لیے وجہ فضیلت جانتے ہیں۔ حالانکہ سرکاری مناصب کی قدر و وقعت اہل علم کے قبول کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ یہ مناصب اُن کی قدر و منزلت کو بڑھاتے ہیں۔

حسن عباسی: گزشتہ کچھ عرصے سے ادبی محافل سے دور رہنے کی کیا وجہ ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: پیرومرشد علامہ اقبال کے بقول:

تیری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

کوئی محفل اس قابل ہوگی تو ہم سر کے بل پہنچیں گے اور کوئی ہمیں اس قابل سمجھے گا تو زبردستی گھسیٹ کر لے جائے گا۔

حسن عباسی: کیا گزشتہ کچھ دہائیوں سے پاکستان میں نظم اچھی لکھی جا رہی ہے یا غزل؟

ڈاکٹر کوثر محمود: اچھی نظم بھی لکھی جا رہی ہے اور اچھی غزل بھی لکھی جا رہی ہے لیکن ہر دو اصناف میں کم کم اچھا لکھا جا رہا ہے۔ اکثر لوگ مقبولِ عام روش کو اپناتے ہیں اور بہت کم اپنی روش کو مقبولِ عام بنانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ بہرحال اس بارے میں کوئی فوری اور قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

حسن عباسی: اگر آپ کو چیئرمین اکادمی ادبیات بنا دیا جائے تو پہلا کام ادب کے حوالے سے کیا کریں گے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: اوّل تو یہ ناممکنات میں سے ہے لیکن فرضِ محال ایسا ہو جائے تو پہلا کام یہ ہوگا کہ ادیبوں شاعروں کو یہ بتلانا ہوگا کہ اکادمی ادبیات کا اصل فرضِ منصبی ہے کیا؟

ہماری اکادمی ادبیات شاید فرنچ اکادمی کا ایک بھونڈا چربہ ہے۔ فرنچ اکیڈمی کا چیئرمین تو کجا، کوئی عام رُکن بھی کوئی غیر ادیب شاعر یا فن کے حوالے سے کوئی ممتاز مقام نہ رکھنے والا نہیں بن سکتا۔

فرنچ اکادمی کے ۴۰ مستقل ارکان ہیں اور یہ تاحیات ارکان ہوتے ہیں اور ان ہی میں سے انتخاب کے ذریعے سیکرٹری یا چیئرمین بنتا ہے۔ کسی رُکن کی وفات یا معذوری کی وجہ سے اُس نشست پر مختلف اُمیدواروں میں انتخاب ہوتا ہے اور صرف اہل علم کو ہی اس منصب کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ ووٹر کی کوئی بھی اہلیت مقرر کر لیں صرف اُنہی کی رائے سے ارکان اور چیئرمین کا انتخاب ہونا چاہیے۔ ہم کسی سرکاری افسر کو ادب کے زوال کا کیسے ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ تو تبدیل ہو کر کل کہیں اور چلا جائے گا اُس کی جگہ کوئی اور خوشامدی، چاپلوس یا نااہل شخص حکام بالا کی اشیرباد

سے ''ہچومن دیگرے نیست'' کا ورد کرتا ہوا ایک عرصے تک ادب اور ادیبوں کے سر پر مسلط رہے گا۔

اگر ادیب اور شاعر جمہور اور عوام کے لیے لکھتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اپنے اندر جمہوریت لانا ہوگی۔ ورنہ سب کچھ ایسا ہی چلتا رہے گا جیسا کہ ہو رہا ہے۔

سلیم گورمانی: اگر آپ کو ہفت زبان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فرانسیسی زبان سے اُردو میں براہِ راست بہت کم تراجم ہوئے ہیں۔ ''موی گیند'' کے بعد آپ نے فرانسیسی سے مزید تراجم کیے ہیں۔ ان کی کچھ تفصیل بتائیں۔''

ڈاکٹر کوثر محمود: موپساں کی کہانیوں کے تراجم ''موی گیند'' کے بعد میں نے موپساں کی مزید کئی کہانیوں کے تراجم کیے ہیں۔ ''موی گیند'' کے اگلے ایڈیشن کی ضخامت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔

واقعی فرانسیسی سے اُردو میں براہ راست ترجمہ بہت ہی کم ہوئے ہیں۔ غالباً اس وقت زندہ ادیب شاعروں میں ناچیز کو ہی یہ فضیلت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں وولٹیر (اصل تلفظ وولتیغ) کے کچھ منتخب مضامین کا ترجمہ بھی ہوا پڑا ہے۔ دیکھئے کب چھپنے کی نوبت آتی ہے اور کون ہمیں چھاپتا ہے۔ نیز کچھ فرانسیسی نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں لیکن تاحال ابھی نہیں چھپے۔ علاوہ ازیں اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے ایک اور مشقتی کام شروع کیا ہے۔ اس کے کچھ خدوخال واضح ہوتے ہیں تو پھر اس پر بھی بات ہوگی۔

سلیم گورمانی: آپ کی شاعری میں کچھ عرصے سے ''خوشبو'' بہت شور مچا رہی ہے۔ آپ نے خوشبو پر کتنے اشعار کہہ رکھے ہیں۔ نیز اُردو شاعری میں خوشبو کے موضوع پر بھی آپ نے کام کر رکھا ہے۔ وہ کہاں تک پہنچا؟

ڈاکٹر کوثر محمود: ''خوشبو کا سفر'' اُردو شاعری میں خوشبو کے استعارے کے حوالے سے شاید میری ادبی زندگی کا واحد اور دلچسپ ترین کام تھا کہ جس نے تقریباً 5 سال تک مجھے اپنے حصار میں ایسے لیے رکھا کہ واقعتاً دین دنیا کے کسی اور کام کی طرف دھیان گیا ہی نہیں۔ اس کا آغاز ایک نظم ''خوشبو کا کھیل'' کے تجزیے سے ہوا جو 15/20 صفحات پر مشتمل تھا لیکن یہ مقالہ پھیلتے پھیلتے 70 سے زائد صفحات تک چلا گیا۔ اس میں دو سو صفحات سے زائد کا مقدمہ ہے کہ خوشبو دراصل ہوتی کیا ہے؟ ہم اسے کیسے محسوس کرتے ہیں؟ ہمارے احساسات و جذبات سے خوشبو کیا کیا تعلق ہے؟ ہمارے نفسیاتی اور جنسی رجحانات میں خوشبو کیا کردار ادا کرتی ہے؟ زمانہ قدیم سے ۔! کر ہندو اساطیری روایات، قدیم تاریخ سے پیرس کی پرفیوم انڈسٹری تک اور ایک باب اروماتھراپی یعنی خوشبو سے مختلف بیماریوں کا علاج وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں میر تقی میر سے لے کر آج کے 350 جدید شعراء کا منتخب کلام، خوشبو کے موضوع پر 2 ہزار سے زائد اشعار اور نظموں کا حوالہ اور تقریباً 125 صفحات کے حوالہ جات ہیں اور پس نوشت کے عنوان سے کچھ منفرد واقعات کا بیان ہے جو خوشبو کے سلسلے میں ناچیز کے مشاہدے میں آئے۔

بہرحال یہ کام اتنا دلچسپ تھا کہ ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ میری محویت کا کیا عالم تھا۔

غالباً دسمبر کا کوئی دن تھا۔ میری اہلیہ رات 10 بجے کے قریب رات کا کھانا لے کر آئیں۔ میں اس دن ''غیر محسوس انسانی خوشبو'' یعنی ''فیرومون'' کا باب لکھ رہا تھا۔ میں نے اہلیہ سے کہا کہ کھانا سائیڈ ٹیبل پر رکھ دو۔

صبح 7 بجے جب بچوں کو سکول تیار کروانے کے لیے میری اہلیہ دوبارہ میرے کمرے کے سامنے سے گزریں تو استفسار کیا کہ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟ تو میرے منہ سے نکلا، اچھا کون سا کھانا؟ یعنی 8/9 گھنٹے ساتھ ہی رکھے ہوئے کھانے کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔

بہرحال ان 5 سالوں میں غیر محسوس طریقے سے میری شاعری میں خوشبو کا ذکر ہوتا چلا گیا اور معلوم شعراء میں خوشبو کے موضوع پر تادمِ تحریر میرے اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یعنی 350 سے زائد ہے۔ دوسرے نمبر پر شبہ طراز کے 300 کے قریب اشعار ہیں۔ پھر نذیر قیصر کے 95 کے قریب اشعار ہیں اور پھر پروین شاکر ہیں کہ جن کے ہاں صرف 60 کے قریب مقامات پر خوشبو کا حوالہ ملتا ہے۔ مجھے اپنے اشعار کے معاصر کے بارے میں تو کوئی دعویٰ نہیں لیکن تعداد میں یقیناً سر دست سب سے زیادہ ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بڑے بڑے ناموں کے ہاں خوشبو کے موضوع پر صرف ایک آدھ شعر ہی برآمد ہوا اور وہ بھی کوئی تاثر چھوڑے بغیر لیکن نئی غیر معروف شعراء نے خوشبو کو ایسے ایسے زاویوں سے دریافت کیا کہ سبحان اللہ، مثلاً ثمینہ راجہ کہتی ہیں:

چمن میں جب کہ یہ خوشبو کی اصل جانتے تھے
تو سادھوؤں کی طرح پیڑ مسکرائے گئے

جی! خوشبو پر کتاب کمپوز ہو کر تیار ہے لیکن کوئی پبلشر اسے چھاپنے کو تیار نہیں لیکن اس کے جستہ جستہ حصے اسلامی یونیورسٹی اور دیگر جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

سلیم گورمانی: اقبال پر بھی آپ نے تحقیقی کام کیا ہے۔اس کے بارے میں بتایئے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: اقبال پر تقریباً 70 کے قریب چھوٹے چھوٹے تشریحی و توضیحی مضامین لکھنے کا ارادہ تھا۔ 15/20 لکھے بھی گئے لیکن اقبال کچھ اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ کچھ لکھنے کے بجائے اُس سے حظ اُٹھانے لگتا ہوں اور کام وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔مثلاً اقبالؔ پر قرۃ العین طاہرہ کے اثرات پر لکھ رہا تھا تو جب طاہرہ کا یہ شعر نظر سے گزرا تو بس قلم چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا، آگے کچھ لکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

تو چہ فلس ماہیٔ حیرتی، چہ زنی ز بحرِ وجود دم
بنشیں چو طاہرہ دم بدم بشنو خروشِ نہنگ لا

ایک مقام پر حضرت علامہ نے طاہرہ کے ایک شعر مع کا کیا خوبصورت ترجمہ کیا لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر پڑی۔

بندہ و خواجہ در ہم آویزند
لاعبید یرا ولا ارباب
(طاہرہ)

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
(اقبالؔ)

بس یہ سلسلہ فترت کا شکار ہے دیکھئے کب اشارۂ غیبی ہوتا ہے۔

سلیم گورمانی: حال ہی میں آپ نے ترکی، ایران اور متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا ہے۔سنا ہے کہ آپ ان مقامات کا سفرنامہ لکھ رہے ہیں؟

ڈاکٹر کوثر محمود: جی حضرت، ہمارے پیر و مرشد سائیں جی کے توسل اور اعانت قونیا میں مولانا روم اور شمس تبریزی کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ بہت کچھ دیکھنے اور گھومنے پھرنے کا ارادہ تھا لیکن جب قونیا پہنچا تو جو وقت میسر تھا وہ تمام وقت مولانا کے مزار پر بس بیٹھا رہا اور مقامِ اقبالؔ (علامہ اقبال کا علامتی مزار جو مولانا روم کے مزار کے پہلو میں) کی سرشاری میں گم رہا، نہ کسی اور کی طرف دیکھنے کا خیال آیا اور نہ کہیں اور جانے کی ہمت پڑی۔

بہر حال مولانا روم کی زیارت اور اقبالؔ کے تکیے کو بوسہ دینا شاید اس تمام سفر کا ماحصل تھا اور یقین کیجیے کہ تقریباً دس منٹ ایسے تھے کہ مجھے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جانا ہے؟ سب سوالات بے معنی تھے۔

بہر حال 70 کے قریب صفحات لکھے ہیں لیکن قونیا کے قریب پہنچتے پہنچتے ہمت جواب دے گئی۔ بس کچھ نہیں لکھا تھا۔ دیکھئے کب اجازت ملتی ہے یا کب توفیق ہوتی ہے۔

سلیم گورمانی: وہاں کیا محسوس کیا؟

ڈاکٹر کوثر محمود: الفاظ ساتھ نہیں دیتے......بس وہ محسوسات کی دنیا ہے۔جیسا کہ آپ کسی خوشبو کو کتنا بیان کر سکتے ہیں؟ اسے بس محبوب ہی کیا جا سکتا ہے لیکن اتنا ضرور شیئر کروں گا کہ وہاں جا کر تمام علائق دنیا ختم ہو کر رہ گئے۔ بالکل ایک خالی سلیٹ بچی ہے نہ کہ شاید جس پر ماسوا کچھ بھی تحریر نہیں۔ ایسے ایسے لوگ کہ جن سے جدا ہونے کا تصور ہی محال تھا اب اُن کا ہونا نہ ہونا بالکل برابر ہے اور بقول حافظ شیرازی:

تلقین درسِ اہل نظر یک اشارت است
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

سلیم گورمانی: ایران میں کہاں کہاں گئے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: مشہد کے قریب طوس ہے۔ وہاں فردوسی کی زیارت کی۔وہاں سے 120 کلومیٹر کے قریب نیشا پور ہے وہاں حکیم عمر خیام اور فرید الدین عطار اور حیدر یغما کے آستانے پر حاضری دی۔ ایک رات مشہد میں امام رضا کے ہاں گزاری اور ایک دن تختِ جمشید میں شاہانِ سلف کے انجام سے عبرت کشید کی۔

اور ایک دن اصفہان، نصف جہان کے مقولے کی صداقت پر صادر کرنے میں گزرا اور ایک پورا دن، رئیس المقر لین سعدیؔ شیرازی اور بلبل شیراز حافظ شیرازی کی چوکھٹ پر جبین نیاز کو جھکائے رکھا۔

ایران میں فارسی شعراء کی جو قدر و منزلت ہے کاش اس کا عشر عشیر بھی ہمارے ہاں ہوتا۔ حافظ، سعدی، عمر خیام، فردوسی ان کے مزارات آرائش و جہاں میں ہمارے کسی بھی خوبصورت ترین پارک سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ وہاں خوبصورتی، فرحت اور جمال کی فراوانی نظر آتی ہے اور یہاں اول تو کسی شاعر کے مرقد کا کسی کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو وہاں خاک ہی اُڑتی ہے۔ اقبالؔ جیسے نابغہ روزگار کو ہم نے شاہی مسجد کے ساتھ ایک ذیلی اور غیر اہم حیثیت دے رکھی ہے۔

آپ یقین کریں کہ اقبال کے نام پر ناچیز کو سوار کرانے کے لیے ایران میں ایک کلوز فلائٹ کو 10 منٹ کے لیے روکا گیا اور جہاں جہاں اور جس جس نے اقبال لاہوری کا نام سنا تو 'سلام بر اقبال، درود بر اقبال' کے تہنیتی کلمات سے خیر مقدم کیا۔

اور ہم نے اقبالؔ کے مزار کو خاردار کانٹے والی تاریں لگا کر عام زائرین کا داخلہ بند کر دیا۔ کیونکہ دہشت گردی کا خطرہ ہے تاکہ عوام کا اقبال سے رہا سہا تعلق بھی ختم کیا جا سکے۔

حضرت جی ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ ہم

چاروں دوست بلکہ چاروں درویش ایک رات جاوید منزل پر گزاریں۔ وہاں اقبال کے بارے میں باتیں کریں اوران کی موجودگی کومحسوس کریں۔ جاوید منزل کو 24 گھنٹے کھلا رکھنے میں کیا اندیشہ نقص امن ہے؟

چھوڑیں بات لمبی ہوتی جائے گی

سلیم گورمانی: فرانسیسی کے کلاسیکی کام کے علاوہ آج کے جدید زمانے کے لٹریچر اور خاص طور پر شاعری سے بھی اُردو خواں طبقہ کومتعارف کروانے کا آئیڈیا کیسا ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: بہت اچھا آئیڈیا ہے لیکن کاش میرا دن 24 گھنٹے کے بجائے 25/26 گھنٹے کا ہوتا تو شاید یہ بھی ممکن تھا پہلے سے جاری کام تکمیل پذیر ہوتے دکھائی نہیں، کوئی نیا پراجیکٹ شروع کرنا خود سے اپنے متعلقین سے اور اپنے پروفیشن سے زیادتی ہے۔ ادب سے گھر کا چولہا چوکا نہیں جلتا۔

حسن عباسی کی دوست مندا کرانتا سین کے تعاون سے کچھ بنگالی شاعرات کا اُردو میں ترجمہ کرنے کا آغاز کیا تھا۔ وہ میرا پراجیکٹ بھی ادھورا پڑا ہے۔ ہر چند کہ کچھ شاعرات کا ترجمہ ہوا بھی۔ مثلاً مندا کرانتا سین تسلیمہ نسرین وغیرہ۔

سلیم گورمانی: آپ کی پنجابی شاعری بھی خاصے کی چیز ہے۔ پنجابی مجموعہ کب دے رہے ہیں؟

ڈاکٹر کوثر محمود: حضرت جی! اُردو شاعری کوکس نے پڑھا ہے یا سراہا ہے کہ پنجابی شاعری کو بھی پلے سے خرچ کر کے چھاپا جائے، مفت تقسیم کیا جائے اور پھر بھی اسے کوئی نہ پڑھے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ پنجابی شاعری کو سکھ دوستوں نے بہت پسند کیا ہے لیکن یہاں کسی کے نوٹس میں بھی نہیں کہ ہمارا پنجابی سے کچھ تعلق ہے بھی کہ نہیں لاہور میں ہی پنجابی کانفرنس بھی ہوئی۔ صوفی کانفرنس بھی ہوئی اور مشاعرے تو آئے روز ہوتے رہتے ہیں لیکن پنجابی کے کرتا دھرتا لوگوں کی ترجیحی فہرست میں ہمارا نام شاید ہے ہی نہیں یا کہیں بالکل آخر میں ہے۔ بہرحال یوٹیوب پر کچھ چیزیں موجود ہیں جن سے ہماری پنجابی دربار میں حاضری اور تنقید کے لگتی رہتی ہے۔

اگر آپ تناسب کی بات کریں تو اُردو شاعری کے حوالے سے اگر کوئی ایک شخص جانتا ہے تو پنجابی کے حوالے سے دس جانتے ہیں اور فرانسیسی تراجم کے حوالے سے ۱۰۰ لوگوں نے تعریف و تحسین کی ہے۔

سمندر منصوری: خوچہ! کیا وجہ ہے کہ 18/20 کروڑ کی آبادی والے ملک میں کتاب 500 کی تعداد میں چھپتی ہے اور وہ بھی نہیں بکتی؟

ڈاکٹر کوثر محمود: اسے نرم سے نرم الفاظ میں بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ علم و ادب کی اس سے بڑھ کر بے توقیری اور کیا ہوگی کہ ایک نغمہ نگار کو لوگ پانچ سو ہزار دے کر بھی ناخوش ہیں اور اسی نغمے کو کوئی بے سُرا گلوکار گا کر ایک لاکھ کما لیتا ہے اور اسی نغمے پر رقص کرنے والی کروڑ سے زیادہ سمیٹ لیتی ہے۔

میں آپ کی توجہ پھر اکادمی ادبیات کی طرف لانا چاہوں گا کہ اس کا اصل کام اردو زبان و ادب کی ترویج ہے۔ اگر وہ اپنا کام نیک نیتی سے کریں گے تو کتاب کی اشاعت از خود بڑھ جائے گی۔ اسی ملک میں ہیری پوٹر کی کتاب بے انداز و تعداد میں بکی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ آج بھی شاعری کے سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والی اور بکنے والی کتاب ''دیوانِ غالب'' ہی ہے۔

یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ اقبال آج بھی ''جملہ حقوق محفوظ ہیں'' کی زد میں ہے۔ جبکہ قانونی طور پر اقبال کی کسی تصنیف کو جملہ حقوق کے نام پر اشاعت عام سے روکا نہیں جا سکتا۔

میں پھر کہوں گا کہ ایک بے سُرا قوال نجی محافل میں 4/5 گھنٹے کی پرفارمنس کے کم از کم 40/50 لاکھ لیتا ہے اور حکومتی سطح پر ہم تمغہ امتیاز کے ساتھ محض 5 لاکھ دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہیں۔

میں نے ارب پتی علم و ادب کی شخصیت کو مشورہ دیا تھا کہ اگر تم اپنے ایوارڈ کی کوئی قدر و منزلت چاہتی ہو تو میرٹ کے علاوہ تمہارے ایوارڈ کے ساتھ کی رقم کم از کم حکومتی سطح سے دوگنا زیادہ ہونی چاہیے لیکن اُس نے دیگر معاملات دوگنی تو کیا بیس گنا زیادہ رقم خرچ کی لیکن ایوارڈ کی رقم کو محض 50 ہزار تک ہی محدود رکھا اور یہ پیسے آمد و رفت کے اخراجات میں صرف ہو گئے۔

سمندر منصوری: موجودہ لکھنے والے اچھے ادیب و شاعر تو درکنار اچھے قاری بھی نہیں ہیں۔ ان کو کیا مشورہ دیں گے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: آپ نے اپنے سوال میں ہی اس کا جواب دے دیا ہے۔ ہر اچھے ادیب شاعر کو لازماً ایک اچھا اور متنوع موضوعات کا قاری ہونا چاہیے۔

ایک ماسٹر لیول کی تعلیم یافتہ خاتون نے میری ذاتی لائبریری کی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ نے واقعی یہ سب کتابیں پڑھ لی ہیں؟ تو میں نے جواباً کہا کہ نہیں ابھی خرید کر جمع کر رہا ہوں دیکھئے پڑھنے کی نوبت کب آتی ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی اچھی کتاب

نظر آ جائے تو میں فوراً اس خوف سے بھی اُسے خرید لیتا ہوں کہ شاید یہ کتاب کل کلاں کو نہ مل سکے۔ اب تک دو سو سے زائد کتابیں خرید رکھی ہیں کہ جن کو ابھی پڑھنا ہے۔ ابھی شیراز سے دو جلدوں میں فردوسی کا شاہنامہ تقریباً پاکستانی ۹ سو روپوں میں خرید کر لایا ہوں۔ یہاں ایکسپو سنٹر میں ایک پرانی کتابوں والے کی منت کی کہ مجھے شاہنامہ بارہ ہزار میں دے دو لیکن وہ پندرہ ہزار سے کم پر راضی نہ تھا۔ اُس دن میرے پاس صرف بارہ ہزار روپے تھے۔ پندرہ ہزار ہوتے تو میں نے خرید لینا تھا لیکن شیراز کے بس سٹینڈ پر چائے کا کپ پی رہا تھا تو مجھے سٹال پر شاہنامہ نظر آ گیا تو یقین کیجیے کہ ان دوکانداروں نے میرے ساتھ تصویریں بھی بنوائیں اور چائے کے پیسے بھی نہیں لیے اور تقریباً مفت میں (ایرانی کرنسی پتہ نہیں کتنی تھی) 10 ڈالر میں سے کافی سارے ریال واپس کر دیے۔ بعد ازاں حساب کیا تو پاکستانی ۹ سو روپے سے بھی کم بنتے تھے۔

سمندر منصوری: آپ کا ادبی مطمع نظر کیا ہے؟ ادبی تراجم سے کیا حاصل کرنے کا مقصد ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: مطمع نظر تو بڑی مبہم سی اصطلاح ہے اور غالباً میرا مطمع نظر کوئی ہے بھی نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ دنیا میں جو بھی ترقی یا پیش رفت ہوئی، جتنے بھی ذہنی اُفق وسیع ہوئے ہیں صرف اور صرف ترجمے کی بدولت ہوئے ہیں۔ مثلاً ہم عبرانی زبان قطعاً نہیں جانتے۔ تو عبرانی زبان میں ادبی شعری تخلیقات سے کیسے واقف ہو سکتے ہیں۔ کیا یہودی علم اور ٹیکنالوجی میں کسی سے کم ہیں۔ اس سے استفادہ ترجمے کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔

اور تو اور اگر کوئی شخص عربی یا سنسکرت نہیں جانتا تو ترجمے کے بغیر اُسے کیسے بتایا جا سکتا ہے کہ قرآن اور ویدوں میں کیا کیا علم و حکمت اور ادب کے جہان آباد ہیں۔

سمندر منصوری: آپ ایک طرف ڈینٹل سرجن ہیں، موسیقی، شاعری، مختلف زبانیں ہیں، تراجم ہیں کیا آپ ان سے انصاف کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر کوثر محمود: سچی بات تو یہ ہے کہ خان بھائی کسی ایک سے بھی انصاف نہیں ہوا۔ دن تو وہی 24 گھنٹے کا ہے اہل خانہ کا شکوہ بھی بجا ہے کہ ہمیں وقت نہیں دیتے۔ مریض شاکی ہیں کہ زیادہ وقت شاعری اور موسیقی کو دیتے ہیں۔ موسیقی سے وابستہ افراد کب کے ہمارا جہلم تو کیا برسی بھی کرا بیٹھے اور اہل ادب نے از خود یہ فرض کر لیا ہے کہ ہمارے پاس علم و ادب کے لیے قطعاً کوئی وقت نہیں ہے اور واقعتاً جس طرح کی ادبی سرگرمیاں ہو رہی ہیں وہ محض وقت کا ضیاع ہیں۔ بس جتنی توفیق ملتی ہے کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ نہ صلے کی پرواہ ہے نہ ستائش کی تمنا۔

سمندر منصوری: ہر شخص کا کوئی نہ کوئی سورس آف انسپائریشن Source of Inpiration ہوتا ہے۔ آپ کو یہ فیض کہاں سے ملتا ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: ہر زبان کا اعلیٰ ادب آپ کے اندر ایک تخلیقی تحریک کو بیدار کرتا ہے۔ اسی طرح ہر اچھا چہرہ، خوبصورت منظر ادب پارہ آپ کے ذوقِ جمال کو نکھارتا ہے اور جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح اچھے لوگوں کی صحبت آپ کے قلم کو جلا بخشتی ہے۔ پیر و مرشد سلیم گورمانی کی علمی گفتگو سے ہمیشہ قلب و نظر روشن ہوئے۔ عباسی صاحب کے مصرعے پر ہمیشہ گرہ لگانے کی خواہش ہوئی اور آپ سے تو ہمیشہ سنجیدہ کام پر تکرار ہوتی رہی ہے۔ آج بھی اپنے گلے کا اعادہ کرتا ہوں کہ آپ نے ابھی تک غنی خان کے ترجمے کو باقاعدہ شعار کیوں نہیں بنایا۔

آپ کیوں نہیں چاہتے کہ ایک معقول، خوبصورت اور روشن خیال پشتو شاعر اُردو ادب کے قارئین تک پہنچے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ ڈالر کمانے کے چکر میں غنی خان کو بھولے ہوئے ہیں جس کا مجھے بھی گلہ ہے اور غنی خان بھی آپ سے خفا ہوگا۔

سمندر منصوری: جتنا کام آپ کر چکے ہیں آپ اُس سے مطمئن کس حد تک ہیں؟

ڈاکٹر کوثر محمود: جہاں تک ذاتی اطمینان کی بات ہے تو بالکل مطمئن نہیں لیکن یہ بات سچ ہے کہ جو کچھ بھی کیا پوری محنت اور ایمانداری سے کیا اور قبولیتِ عامہ نہ میرا مسئلہ ہے اور نہ میرے بس میں ہے۔

سمندر منصوری: ادیبوں شاعروں کو اور عام قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: ادیبوں شاعروں سے درخواست ہے کہ تخلیقی سطح پر تو وہ اردو کی ثروت مندی کے لیے کام کر رہی رہے ہیں لیکن کم از کم اپنی کسی ایک تخلیق کا دنیا کی کسی دوسری زبان میں ترجمہ کریں اور دنیا کی کسی بھی زبان کی کم از کم ایک تخلیق کا اُردو میں ترجمہ ضرور کریں۔ انگریزی تو ہر دوسرا ادیب شاعر مناسب حد تک جانتا ہے ورنہ علاقائی زبانیں تو کم از کم ہماری توجہ کی طالب ہیں اور آخری بات اُردو لکھنے پڑھنے اور بولنے پر مت شرمائیں۔ بلکہ اسے وجہ افتخار سمجھیں اور علاقائی ادب بھی ہمارا ہے اور ہم ہی اس کے والی وارث ہیں اور اگر آپ اپنے ماں باپ کی طرح اپنی مادری زبان کی عزت نہیں کریں گے تو کوئی اور ان کو عزت نہیں دے گا۔

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

بین الاقوامی ادبی و ثقافتی کانفرنس

پچھلے دنوں لاہور الحمراء ہال میں تین روزہ بین الاقوامی ادبی و ثقافتی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں وزیراعلیٰ پنجاب نے خصوصی شرکت فرمائی۔

اس کانفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ ان تین دنوں میں ادب اور ثقافت کے حوالے سے کل بتیس (32) سیشن منعقد کیے گئے۔ ہر سیشن کے مہمان اور صدور بدلتے رہے۔ افتتاحی تقریب صدر وزیراعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف۔ مہمانانِ اعزاز محترمہ بانو قدسیہ، جناب انتظار حسین، محترمہ فریدہ خانم، جناب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، جناب شمیم حنفی (انڈیا)، جناب میاں اعجاز الحسن اور ملک کے معروف نامور اداکار جناب قوی خاں صاحب تھے۔ اس تقریب کی کمپیئرنگ ملک کے معروف چینل سے وابستہ اینکر محترمہ غریدہ فاروقی تھیں۔ یہ تقریب اس حوالہ سے بھی اہم تھی کہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی ثقافت کے ساتھ ساتھ صوبوں کی زبانوں کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو اور بحث کے علاوہ صوبوں کی شخصیات کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا گیا۔ ہر لحاظ سے یہ تقریب ایک کامیاب تقریب تھی۔ جس میں شرکاء کی دلچسپی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کی طبع کے مطابق پروگرام ترتیب دیے گئے۔ جس کو تمام شرکاء نے اس ادبی اور ثقافتی پروگراموں سے خوب لطف اُٹھایا۔ بلاشبہ اس بات کا کریڈٹ جہاں حکومت پنجاب کو جاتا ہے تو تقریب کے منتظم اعلیٰ جناب عطاء الحق قاسمی کی بھی شب و روز کی محنتیں قابل ستائش ہیں۔ ادارہ ارژنگ اس کامیاب تقریب کی حکومت پنجاب اور عطاء الحق قاسمی کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

شفیق سلیمی کے ساتھ شام

مورخہ 17 نومبر 2015 کو ملک کے معروف شاعر شفیق سلیمی کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ادبی بیٹھک الحمراء ہال میں منعقدہ نشست کی صدارت ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، زاہد مسعود، اعجاز رضوی، ڈاکٹر غافر شہزاد، نعمان منظور اور نوید صادق مہمانانِ اعزاز تھے۔ اس تقریب کو ادارہ مطبوعات نے منعقد کروانے میں تعاون و اہم کردار ادا کیا۔

مشاعرہ

لاہور کی مقامی ادبی تنظیم شہر ادب کے زیر اہتمام الحمراء ادبی بیٹھک میں کراچی سے آئے مہمان شاعر سلمان صدیقی کی صدارت میں ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ جن شعراء کرام نے اپنی نگارشات سامعین کے سامنے پیش کر کے داد سمیٹی ان کے اسماء گرامی کچھ اس طرح ہیں:

باقی احمد پوری، حسین مجروح، ناصر بشیر، شفیق احمد خاں، ریاض رومانی، ممتاز راشد لاہوری، زاہد حسن، کامران ناشط، سلیم صابر، احسان الحق مظہر، ایثار باجوہ، میجر (ر) خالد نصر، انیس احمد، آفتاب خاں، سہیل ثانی اور وارث علی رانا و دیگر شامل تھے۔

لاہور میں عالمی سیمینار اور پیس پوئٹری فیسٹیول
بیرون ملک سے آٹھ شعراء کی شرکت

رابطہ کار: حسن عباسی

میزبان تنظیمیں: ادارۂ خیال و فن، انٹرنیشنل رائٹرز کونسل، لاہور ادبی فورم، بزم پُرنم

14 دسمبر 2015ء کو لاہور کے ایمبسڈر ہوٹل میں عالمی سیمینار اور مشاعرہ ہوا جس میں انڈیا اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے آٹھ شعراء میں شرکت کی۔ لاہور کے تیس سے زائد شعراء و شاعرہ نے بھی کلام سنایا۔ سیمینار کی صدارت اصغر ندیم سید اور مشاعرہ کی صدارت عطاء الحق قاسمی نے کی۔ مہمانان خاص میں انڈین شعراء خوشبیر سنگھ شاد، اشوک شرما چکرا دھر اور رنجیت سنگھ چوہان کے علاوہ سنیئر پاکستانی شاعر غلام حسین ساجد تھے۔ بیرون ملک کے یہ شعراء بھی خاص مہمان تھے۔ الماس شبی (امریکہ)، جواد شیخ (ناروے)، ارشد نذیر ساحل (سپین)، قمر ریاض (مسقط) اور شازیہ نورین (جرمنی) اس باوقار ادبی تقریب کا انعقاد چار ادبی تنظیموں نے مل کر کیا تھا۔

ان میں ادارۂ خیال وفن (ممتاز راشد لاہوری)، انٹرنیشنل رائٹرز کونسل (ڈاکٹر عمرانہ مشتاق مانی)، لاہور ادبی فورم (افتخار شوکت چوہدری ایڈووکیٹ) اور بزم پُرنم (اقبال پیام)، شامل تھے۔ ان سب میں رابطہ کار عالمی شہرت یافتہ شاعر حسن عباسی تھے۔

سیمینار کی نظامت افتخار شوکت نے کی۔ آغاز میں عبدالمجید چٹھہ نے تلاوت کے بعد ترنم سے عطاء الحق قاسمی کی یہ نعت پیش کی اور خوب داد پائی ہے

مرا چارہ گھر مدینے میں منزل و راہبر مدینے میں

استقبالیہ کلمات حسن عباسی نے پیش کیے اور بیرونی شعراء کا تعارف بھی پیش کیا۔ ''ہندی ادب کا تعارف'' کے موضوع پر اشوک شرما چکر ادھر نے مفصل تحریر کی۔ ''ہندوستان کی نئی نسل میں اردو شاعری'' کے موضوع پر رنجیت سنگھ چوہان نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ عطاء الحق قاسمی نے کہا کہ پاک وہند رابطے بڑھنے چاہئیں اور جہاں دیواریں بنیں ان میں دروازے بھی بننے چاہئیں۔ صدر سیمینار اصغر ندیم سید نے پاک وہند کی ادبی صورتحال کی کھل کر اظہار خیال کیا اور کئی تجاویز دیں۔

مشاعرہ جناب عطاء الحق قاسمی کی زیر صدارت ہوا جو کل ہی تین روزہ الحمراء ادبی وثقافتی ادبی فیسٹیول کے کامیاب انعقاد سے عہدہ براہ ہوئے تھے مشاعرے کے پہلے دور کی نظامت ممتاز راشد لاہوری نے، دوسرے دور کی نظامت ڈاکٹر عمرانہ مشتاق اور مہمان شعراء کی دور کی نظامت حسن عباسی نے کی۔ شعراء اور شاعرات کے نام: عطاء الحق قاسمی، اصغر ندیم سید، غلام حسین ساجد، اشوک شرما، خوشبیر سنگھ شاد، رنجیت سنگھ چوہان، شازیہ نورین، قمر ریاض، الماس شمی، جواد شیخ، ارشد نذیر ساحل، باقی احمد پوری، اعتبار ساجد، ممتاز راشد لاہوری، اسلام عظمی، پروفیسر عاشق رحیل، ڈاکٹر خالد جاوید جان، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، محمود غزنی (بوریوالہ)، آغا نثار، احمد سبحانی آکاش، ندیم بھابھہ، راشدہ ماہین ملک (اسلام آباد)، راحیلہ رباب، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، عفت علی، حرا رانا، اعجاز اللہ ناز، نوید مرزا، سمندر منصوری، شاہد رضا، ابرار ندیم، حسن عباسی، زاہد محمود شمس، ڈاکٹر نادر علی شاہ، عزیر احمد، افتخار شوکت چوہدری، آغا ضرار، محمد جمیل، افتخار اشعر، اقبال پیام، ڈاکٹر کاشف رفیق (مظفر آباد) اور فاطمہ احمد

مشاعرے کے دوران معروف گلوگارہ صائمہ جہاں نے فیض کی یہ نظم دلنشین ترنم کے ساتھ سنا کر سماں باندھ دیا۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

مشاعرے میں سو سے زائد افراد نے شرکت کی۔ نمایاں شرکاء کے منشاء قاضی، شفیق سلیمی، ڈاکٹر امجد طفیل، نواز کھرل، صہیب مرغوب، خالد نجیب، مظہر سلیم مجوکہ، طاہر (جیو)، محمد احسن گل، رحمت علی ملک، عبدالمتین ملک، رانا عبدالجبار، شاہد علی قریشی، منیر احمد اور دیگر تھے۔

✾

ہم کہ جس سے بھی پیار کرتے ہیں
اُس کا ہی انتظار کرتے ہیں

آنکھیں اُس سے جو چار کرتے ہیں
زیست کو بے قرار کرتے ہیں

دشمنوں کی صفوں میں شامل ہیں
چھپ کے جو لوگ وار کرتے ہیں

چھوڑ جائے نہ راہ میں کہیں وہ
جس پہ ہم اعتبار کرتے ہیں

اپنے وعدے پہ جب نہ آؤ تم
ہم ستارے شمار کرتے ہیں

اُس کی تصویر دھیان میں لا کر
ذہن کو لالہ زار کرتے ہیں

کوئی اُلجھن نہیں سلجھتی جب
ذکرِ پروردگار کرتے ہیں

قلب جن کا پیام روشن ہو
عاجزی اختیار کرتے ہیں

اقبال پیام/لاہور

ناروے میں مقیم نوجوان نسل کے منفرد شاعر جواد شیخ کا اوّلین مجموعہ

''کوئی کوئی بات'' اشاعت کے آخری مراحل میں

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔ 0300-4489310

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب:محبت کانچ کی گڑیا/شاعر:جمیل احمد جمیل/صفحات: 128 / قیمت: 250روپے/فلیپ نگار:خلیل احمد خلیل

ناشر: دعا پبلی کیشنز،الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور

جمیل احمد جمیل ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا دوست بھی ہے۔شاعری کے فن پاروں کو خوب سمجھتا ہے۔بہترین صلاحیتوں کا مالک ہے۔وہ کہتا ہے کہ یہ صلاحیت خداداد ہے اس میں میرا کوئی کمال نہیں دوستوں اور والدین کی دعاؤں کی بدولت اس مقام کو چھونے کی کوشش کر رہا ہوں۔کوشش کامیاب بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی۔وہ اس یقین کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہے کہ میرا خدا مجھے ضرور عزت بخشے گا۔

نام کتاب:عشق امر بیل سہی/شاعرہ:عرفانہ امر/صفحات: 144 / قیمت: 500روپے/فلیپ نگار:خالد شریف

ناشر: ماورا،مال روڈ،لاہور

عشق ایک مسلک ہے جس پر چل کر سالک سلوک کی راہیں طے کرتا ہے۔عشق جینے کا ایک قرینہ ہے جسے برتنے کا سلیقہ خالق کی طرف سے کچھ منتخب لوگوں کو ودیعت ہوتا ہے۔عشق مجازی ہو تو افضل اور حقیقی ہو تو افضل ترین کہ زندگی بے بندگی شرمندگی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔عشق کی ابتدا اور انتہا معلوم اور نامعلوم کے درمیان کی وہ ملگجی لکیر ہے جسے بابا فریدؒ اور میاں محمد بخش جیسے صوفیا نے پہچانا اور اپنے اشعار میں سمو دیا ہے۔عشق کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں اور عرفانہ امر ان آداب سے بخوبی واقف ہے۔وہ سکہ بند ادیب اور مشاق شاعرہ ہے جسے ادراک ہے کہ کب کہاں اور کیا کہنا مناسب ہے۔وہ اوائل بہار کی خوشبوؤں،پرندوں کے چہچہوں اور فطرت کی نیرنگیوں کو نظم کرنے کا گر جانتی ہے۔وہ خوب سمجھتی ہے کہ عشق جان لیوا ہے لیکن اس کے بغیر بھی تو زندگی کا کوئی مصرف کوئی مطلب نہیں۔''عشق امر بیل سہی'' عرفانہ امر کے احساسات کی تازہ ترین دستاویز ہے۔

نام کتاب:عالم دشت/شاعر:سہیل یار/صفحات: 152 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار:جاوید قاسم

ناشر: علی عون پبلی کیشنز،لاہور

سہیل یار کا پہلا مجموعہ غزل ''عالم دشت'' میرے سامنے ہے اور میں اسے جیسے جیسے پڑھتا جا رہا ہوں میرے اندر کا انسان مجھے اس سچائی کا اظہار کرنے پر مجبور کر رہا ہے کہ سہیل یار کا شمار بھی ادب کے اُس سچے اور سُچے قبیلے میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمیشہ شعر کی آبرو کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان شاخوں کو بھی قلم کا روپ عطا کیا جن سے اہل جہاں صلیبیں بناتے چلے آ رہے ہیں۔وہ اپنے فن سے اس قدر مخلص ہے کہ بہ وقت نزول شعر اپنے اور شعر کے درمیان کسی ڈر یا کسی جانے انجانے خوف کو کبھی حائل نہیں ہونے دیتا۔اُس کا قلم ایسے ایسے حساس موضوعات صفحۂ قرطاس پر بلا خوف وخطر رقم کر دیتا ہے جنھیں سوچنا بھی ناقابل معافی جرم تصور کیا جاتا ہے۔

نام کتاب: اس کا ملنا تو خواب جیسا ہے/ شاعر: اقبال پیام/صفحات: 128 / قیمت: 250 روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: بزمِ پرنم، 2 ہسپتال روڈ، پان منڈی، نیو انارکلی، لاہور

اقبال پیام اپنی شاعری کی طرح سادہ اور آسان ہے۔ وہ اپنی شاعری کے اندر مصرعہ مصرعہ بکھرا ہوا ہے۔ اُس نے دوستوں کے ساتھ قہقہے لگائے ہیں۔ جبکہ اپنے اندر کے دکھ شعروں میں بیان کیے ہیں۔ اُس کی شاعری کا بنیادی موضوع تو محبت ہے مگر یہ محبت کسی لڑکی سے کم اور دیگر رشتوں کے حوالے سے ہمیں زیادہ نظر آتی ہے۔ کبھی وہ اُستاد پرنم کی محبت میں شعر تخلیق کرتا ہے تو کبھی دوستوں سے گلے شکوے غزلوں میں کرتا ہے۔ کہیں ماں باپ کی محبت میں مصرعے تخلیق کرتا ہے تو کبھی چاند کی محبت میں اشعار لکھتا ہے۔ میں اسے پہلے شعری مجموعے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دُعا گو ہوں کہ اللہ اُسے مزید عزت دے۔ آمین

نام کتاب: حاصل/ شاعرہ: صائمہ اسحاق/صفحات: 160 / قیمت: 150 روپے/تبصرہ نگار: محمد یعقوب

ناشر: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

صائمہ اسحاق کے اشعار خبر دیتے ہیں کہ وہ صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور اس نے اب تک کے سفر میں اچھا خاصا زادِ سفر بھی جمع کرلیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ وہ اس زادِ سفر کو کام میں لائے اور اس کی ایک ایک چیز سے فائدہ اُٹھائے۔ اعتماد بہت قیمتی چیز ہے۔ صائمہ کو خود پر اعتماد ہے اور میں بجا طور پر اُمید کرتا ہوں کہ وہ اپنے سفر پر رواں رہے گی۔ تاہم ایک بات ضرور کہوں گا۔ راہرووں کی اس بھیڑ میں اپنی شناخت بنانے کے لیے اس کو شروع ہی سے محتاط رہنا ہوگا۔ اس کے سامنے سب سے بڑی مشکل دورِ حاضر کا بے سمتی کا رجحان، روایت سے بے زاری اور بھیڑ چال کا ماحول ہے۔ صائمہ کو یہ مشکل بھی سر کرنی ہوگی۔ آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنانے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ چابک تب ہاتھ میں آتا ہے جب آپ کی حرف سے دوستی ہو جائے۔ اس کے ذرا سے غیر محتاط استعمال سے حروف بدک بھی سکتے ہیں۔ صائمہ اسحاق کو روایت سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے جدید رویوں کی دنیا میں اپنی شناخت بنانی ہے۔ مجھے اعتماد ہے کہ وہ ایسا کرسکتی ہے!

نام کتاب: بلاوا/ مصنف: سید طارق جاوید مشہدی/صفحات: 232 / قیمت: 350 روپے/تبصرہ نگار: ادارہ

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

طارق جاوید شاہ مشہدی کا تعلق تحصیل جہانیاں کے علاقہ اللہ داد کیٹل فارم 102/10.R ظفر آباد سے ہے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ ہے۔ اس وقت پاکستان کے ایک بڑے پرائیویٹ سکول سسٹم بلوم فیلڈ ہال سکول لعل پیر پاور پلانٹ محمود کوٹ مظفر گڑھ میں بطور پرنسپل کام کر رہے ہیں۔ علم و ادب سے وابستگی انھیں وراثت میں ملی۔ ان کے والد سید ابراہیم شاہ مشہدی علاقہ جہانیاں کی معروف شخصیت ہیں۔ وہ فارسی، اُردو اور عربی کے مستند استاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ بھائیوں سید خالد جاوید مشہدی، ڈاکٹر احمد فارق مشہدی اور سید محمد اسحاق شاہ کا علم و ادب سے گہرا شغف ہے۔ طارق مشہدی مختلف اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں۔ روزنامہ پاکستان میں ''نشر صبح'' کے عنوان سے کالم بھی لکھتے ہیں۔

نام کتاب: تلمیحاتِ آتش/تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر عبدالغفار کوکب/صفحات: 144 / قیمت: 196 روپے/تبصرہ نگار: پروفیسر ڈاکٹر روبینہ ترین

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

ملتان میں اُردو تنقید کے حوالے سے دو طرح کے لوگ ملتے ہیں، ان میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں منعقد ہونے والی تقریبات میں مضمون پڑھنے کی خاطر محض توصیفی نوعیت کے مضامین کو ہی تنقیدی خیال کر کے سناتے ہیں جبکہ ان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کا سچ مچ تنقیدی نقطہ نظر بھی ہے۔ یہی صورتِ حال تحقیق میں بھی ہے کہ کچھ لوگ ذاتی دلچسپی کے لیے لکھتے ہیں جبکہ بیشتر لوگ ڈگری کے حصول کے لیے۔ انھی میں ہمارے شہر کے کالجز میں تدریس پر مامور وہ اساتذہ بھی ہیں جنھوں نے تنقیدی و تحقیقی نوعیت کا کام اپنے شوق کی بنا پر کیا۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب کا شمار اردو ادب کے ایسے اساتذہ میں ہوتا ہے جو محنتی، دیانتدار، شہرت سے بے نیاز، کسی قسم کی گروہی سیاست یا نقطہ نظر سے لاتعلق رہتے ہوئے اپنی دلچسپی کے پیش نظر تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب کی شخصیت اور صلاحیتوں کو میں نے اُس وقت جانا جب وہ ایم فل کے تحقیقی مقالے کے لیے میرے پاس آئے۔ بڑی خاموشی سے مؤدب رہتے ہوئے میری جانب سے دی گئی اصلاح کے مطابق کام کرتے رہے۔ ان کا مقالہ ''اخبار جنگ کے فکاہیہ کالم'' کے عنوان سے تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے ہمارے شعبہ اُردو سے ''اُردو میں فکاہیہ کالم نگاری، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر نہ صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی بلکہ اسے کتابی صورت میں بھی شائع کرایا۔ اس دوران وہ ایک بڑے حادثے سے بھی گزرے۔ مگر ہمت نہ ہاری اور ان کی تحقیقی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ''محاوراتِ آتش'' کے عنوان سے اُردو کے کلاسیکی شاعر حیدر علی آتش کی غزلوں میں سے محاورات نکال کر اس کتاب میں اکٹھے کیے اور اب ''تلمیحاتِ آتش'' کے عنوان سے انھوں نے ایک اور کتاب ترتیب دی ہے جو اُن کی محنت طلب، طبیعت لگن اور حیدر علی آتش کی غزل سے دلچسپی کا واضح ثبوت بھی ہے۔ میرے خیال میں ان کا آئندہ کام تنقیدی نوعیت کا ہوگا جس میں وہ حیدر علی آتش کو اس کے زمانے کے سیاسی، سماجی تناظر میں دیکھتے ہوئے کچھ نئے موضوعات سامنے لائیں گے۔

نام کتاب: زندہ ہیں شاہین/مصنف: محمد نوید مرزا/صفحات: 144 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: قاضی جاوید

ناشر: رحمانیہ کتاب مرکز، لاہور

ہمارے شاعروں نے پشاور کے معصوم شہیدوں کے لیے سینکڑوں سوگوار نظمیں اور دکھ بھرے گیت لکھے اور اُن کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اب معروف شاعر اور ادیب نوید مرزا نے ایک قدم آگے اُٹھایا ہے۔ انھوں نے پشاور سانحہ کی پہلی برسی کے موقع پر اس عظیم المیہ اور اُس کے پس منظر کو ''زندہ ہیں شاہین'' کے عنوان سے ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول ہمارے قومی ادب میں قابل ذکر اضافہ ہے۔ وہ ہم کو معصوم شہیدوں اور اُن کے شہید اساتذہ کی یاد دلاتا رہے گا اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کی تحریک دیتا رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب اس تخلیقی کاوش کے لیے نوید مرزا کے ممنون رہیں گے۔

نام کتاب: خود ساختہ ناخدا/مصنف: گلزار جاوید/صفحات: 170 / قیمت: 350 روپے/تبصرہ نگار: فیروز عالم

ناشر: مطبوعات فرحان، راولپنڈی

گلزار جاوید کی زیر نظر کتاب ''خود ساختہ ناخدا'' اپنے انداز تحریر کے لحاظ سے ایک یکتا کتاب ہے۔ اس میں گلزار جاوید کا انداز نمایاں ہے۔ ان کی تخلیقات پڑھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ زبان و بیان پر مکمل طور پر حاوی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ برصغیر کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کا استعمال وہ اپنے افسانوں میں اس طرح کرتے ہیں کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ''شبھ چنتک'' میں ہندی اور پنجابی ملی اُردو ہو یا ''موئی'' میں گلیوں میں بیٹھے موالیوں کی زبان۔

اسی طرح وہ کبھی کبھی اپنے افسانوں میں دلی کی ٹکسالی کی زبان کا ایسا رنگ بکھیرتے ہیں کہ مجھے خواجہ حسن نظامی اور ملا واحدی کی یاد آجاتی ہے۔ افسانے کی بنت پر ان کو مکمل عبور حاصل ہے اور خاص طور سے افسانے کا اختتام قاری کے ذہن کو ایک جھٹکا ضرور لگاتا ہے جس کی وجہ سے قاری مجبور ہو جاتا ہے کہ کچھ لمحے آنکھیں بند کر کے افسانے کے اختتام میں کھو کر رہ جائے۔

نام کتاب: گوش بر آواز/ مصنف: گلزار جاوید/ صفحات: 512 / قیمت: 890 روپے/ تبصرہ نگار: صفوت علی صفوت

گلزار جاوید کی گفتگو اور اُٹھائے گئے سوالات میں ناشرانہ نہیں بلکہ ماہرانہ اندازِ فکر نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ صحافت زدہ نظر آتے ہیں نہ مخاطب کو منفی اندازِ فکر سے زیر کرنے کی خواہش میں حقیقت کو اپنی پسند کے معنی ومفہوم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں ادبا، شعرا اور ناقدین کے فن کے ساتھ شخصیت کو بھی پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ گفتگو کا موضوع بنایا گیا ہے جس سے مکالمے کی اہمیت وافادیت مسلم ہو جاتی ہے۔ یوں تو ان مکالموں پر گفتگو کی بے پناہ گنجائش اور امکانات ہیں مگر ہم فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہوئے علامہ اقبال کے مصرع پر اپنی بات ختم کرنا چاہیں گے ''نوا پیرا بھی ہے بلبل ترنم بھی ہے مستانہ''

نام کتاب: رزس کی پھوہار/ شاعرہ: بسمل صابری/ صفحات: 218 / قیمت: 550 روپے/ تبصرہ نگار: بشریٰ رحمٰن

ناشر: جمہوری پبلی کیشنز

یہ تو کب کا طے پا چکا کہ محترمہ بسمل صابری صاحبہ ایک خوش انداز اور خوش گلو شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری کے کمالات گنوانا تو مشکل ہے، مگر ان کی شاعری کی اثر پذیری پر بات ہو سکتی ہے۔ شاعر ہو، ادیب ہو یا کوئی بھی فن سے وابستہ شخص ہو، اس کے مشہور اور ہر دلعزیز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کلام اور انداز میں انفرادیت ہو۔ دنیا نے ہمیشہ اس کو جانا اور پہچانا جو الگ سا نظر آیا...... منفرد نظر آیا۔ ممتاز نظر آیا اور جس کے کلام کی فسوں سازی نے زمانے کو چونکایا۔ یوں بسمل صابری صاحبہ...... بسم اللہ کا پیرہن اوڑھے صبر کے جھولے میں ہمک رہی تھیں۔ انھیں شاعری ودیعت ہوگئی تھی۔ وہ دھیرج سے سج سج اس ڈگر پر پاؤں جماتی آرہی تھیں کہ ان کی زندگی میں چونکا دینے والا وہ لمحہ آیا جو ہر غیر معمولی شخص کی زندگی میں آتا ہے۔ 1960ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے ایک انعامی مشاعرے کی صورت میں وہ لمحہ نازل ہوا اور بسمل صابری کو بسمل صابری بنا کے ان کی پوری زندگی پر محیط ہوگیا۔

نام کتاب: سچائیں/ مصنف: ڈاکٹر اخلاق گیلانی/ صفحات: 176 / قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

ناشر: کانٹی نینٹل سٹار پبلشرز، اُردو بازار، لاہور

پاکستان میں بھی اس صنف نے مقبولیت حاصل کرنی شروع کر دی ہے۔ متعدد معیاری رسائل میں افسانچوں کی اشاعت اس کا بڑا ثبوت ہے۔ پاکستان کے معروف فکشن نگار، ڈاکٹر اخلاق گیلانی کے بہت سے افسانچے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔ ان کے افسانچے چونکاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز، حرام وحلال، صحیح وغلط، مکاری ودغابازی، دوغلہ پن، سیاسی شعبدہ بازیاں، قول وفعل کا تضاد جیسے زندگی کے رنگوں کو ڈاکٹر گیلانی نے افسانچے کے قالب میں اس فنکاری سے ڈھالا ہے کہ افسانچہ قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ دراصل افسانے کا وصف ہے کہ وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ گیلانی صاحب کے افسانچے زبان کی بھول بھلیوں میں بھٹکاتے نہیں ہیں بلکہ صاف ستھری زبان میں افسانچے اس طور جھٹکے سے ختم ہوتے ہیں کہ وہ قاری کے ذہن پر دیرپا اثرات قائم کرتے ہیں۔

نامہ ہائے احباب

بہت ہی پیارے حسن عباسی دامِ اقبالہٗ

پیار و دعوات! مطلوبہ شمارہ ''ارژنگ'' اور اس ماہ کا شمارہ مل چکا ہے۔ جس کے لیے تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ محبت کے ہزاروں رنگ ہیں لیکن چاہنے اور چاہے جانے کا احساس عجیب مسحور کن ہوتا ہے۔ آپ کی ٹیلیفونک گفتگو سے یہ راز یقین میں بدل گیا کہ آپ نہ صرف حقیقی شاعر ہیں بلکہ آپ کے حوصلوں کی بلندی آپ کی جدوجہد کا بھرپور پن آپ کی خودی، بے خودی اور آپ کا عزم جواں آپ کی بے ساختگی وارفتگی جو حسن گفتگو میں پائی وہی یقیناً آپ کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ یہ چند سطور میں نوکِ قلم پر لاتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں کہ آپ جس طرح سے پرانے نئے لکھنے والوں کو بڑے شہروں کے تخلیق کار ہوں یا مضافاتی جس طرح ایک لڑی میں پرو کر رکھتے ہیں یقیناً آپ کی خدمات ''ارژنگ'' میں نظر آتی ہیں۔ آپ کسی بھی تخلیق کار کو سرد خانے میں نہیں رکھتے۔ آپ کی ادب سے محبت کو میں ''میری کورنچی'' کے حوالے سے اس طرح بیان کروں گی۔ ''محبت ایک دنیا ہے جس میں سکون و اطمینان سے زیادہ اضطرابی اور پریشانی میں ایک لطف و قرار ہے جو دنیا کے عام سکون و اطمینان میں نہیں۔''

ہمارے استاد محترم ایک قلم کار ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''محبت کی تحریر پر کوئی شخص پہرہ نہیں بٹھا سکتا۔ اگر کوئی قانون دان محبت کی تحریر کو روکنے کی کوشش کرے گا تو وہ جان لے کہ وہ خود مٹ جائے گا۔''

'ارژنگ' ادبی دنیا کے اہم پرچوں میں شامل ہے۔ آج دسمبر کی 4 تاریخ ہے 2015 ہم سے روٹھ جائے گا اور عنقریب ہم 2016 میں داخل ہوں گے۔ اللہ کرے سالِ نو رحمتیں، برکتیں لیے ہم پر نازل ہو۔ 2015 کی آخری شام کے حوالے سے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔ اسی حوالے سے تازہ ترین غزل ''ارژنگ'' کی نذر کرتی ہوں، گر قبول۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سورج بھی ہو رہا ہے جدا آج شام کو
آنے لگی ہے ایک صدا آج شام کو
تم احترامِ فصلِ بہاراں نہ کر سکے
پھر سال ایک رُوٹھ گیا آج شام کو
آدابِ نظمِ دوراں سکھایا تو آج نے
بخت چمن سنوار کہا آج شام کو
اس سال شام پھر مرا اعزاز بن گئی
رشتہ تو اس سے ٹوٹ گیا آج شام کو
بسمؔل چمن کی روح میں تحلیل ہو کے دیکھ
ملتے رہیں گے درسِ وفا آج شام کو

بہت محبت اور ہزاروں دعاؤں کے ساتھ دو عدد نئی کتابیں جو 2015 میں تخلیق ہوئیں ''رس کی پھوہار'' پیش ہیں۔

خلوص کیش

بسمل صابری

ساہیوال

رنگ برنگ، ارژنگ حسن عباسی سوہنے من موہنے! السلام علیکم۔

''ارژنگ'' نومبر 2015 مرقع حسن و خوبی اس خزاں رسیدگی میں وجہ تسلی ہوا۔ ٹائٹل کی تصویر نے ایسا محو کیا کہ کیا کہوں۔ اس عالم کو دل گرفتگی کہوں یا حیرانی۔ تادیر بچیوں کی خاموشی میں کھویا رہا۔ آپ نے اپنی زمین کی میری حمد شائع کی۔ آپ کی اس نوازش سے خوشی ہوئی۔ رسالے کے مشمولات حسب معمول (حسب توقع) معیاری ہیں۔ مضامین شعر و نثر کے تنوع کے ذائقے لطف انگیز ہیں۔ آپ شعری حیات کو رسالہ میں زیب و زینت بنا دیتے ہیں۔ آپ کے شعری مزاج کا بے ساختہ پن ورق ورق مترشح ہے۔ مدیر شاعر ہو تو وہ اپنے ادبی تشخص کو برنگ تصویر رسالے کے کسی نہ کسی صفحے پر ضرور سجاتا ہے۔ اس طرح آپ کو اور عامر بن علی کو 'پا' کر جی خوش ہوتا ہے۔ آپ پڑھنے والوں کے ذوق اور خوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ آپ میری غزلیہ افتاد کو اپنے مزاج سے ذرا ہٹ کر دیکھا کریں۔ میں جو لکھتا ہوں یا کہتا ہوں

اس میں یہاں کی آب و ہوا کے مزے ہوتے ہیں۔آپ کیا جانیں بوئی کے موسم آپ 'جاپان' سے ہو آئیں تو آپ کو 'بوئی' دکھاؤں۔ مجھے ''ارژنگ'' بہت پسند ہے۔عطاالحق قاسمی ہمارے محترم ہیں۔ ان سے التجا ہے کہ ارژنگ، آخر ارژنگ ہے۔اسے اسی تناظر میں ملاحظہ کریں۔ ممتاز شاعر اقبال راہی کی باتوں نے جی موہ لیا۔حمد سائیں نے مبہوت کر دیا۔سارے شعر اچھے ہیں۔ مثال کےطور پر یہ ایک شعر

ہم سے برداشت ہونہیں سکتیں
تا قیامت جدائیاں سائیں

خیراندیش

آصف ثاقب

بوئی ہزارہ

جناب حسن عباسی صاحب! السلام علیکم۔

غزل برائے ارنگ ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ معہ اہل خانہ اور دیگر احباب بخیر ہوں گے۔

نصرت صدیقی

محترم حسن عباسی صاحب

مدیر''ارژنگ''لاہور

السلام علیکم۔''ارژنگ'' نومبر 2015 نظر نواز ہوا۔آپ نے اس میں میری ایک غزل اور میرے افسانوں کے مجموعہ''دل زدہ'' پر نوید مرزا کا تبصرہ شامل کیا ہے۔جس کے لیے شکر گزار ہوں۔

مدیر اعلیٰ ''ارژنگ'' جناب عامر بن علی کو ہماری تنظیم ''ادارۂ خیال و فن'' نے اکادمی ادبیات لاہور مرکز میں ظہرانہ دیا تھا۔آپ نے اس کی رپورٹ بھی شامل کی ہے۔مگر اس میں صدر تقریب ڈاکٹر عمرانہ مشتاق کا نام نہیں آ سکا۔ نیز اس تقریب میں ڈاکٹر صغریٰ صدف نے بھی اظہار خیال کیا تھا اور گلدستہ بھی پیش کیا تھا۔یہ ذکر بھی رہ گیا ہے۔قارئین کی معلومات کے لیے لکھ دیا ہے۔ سلامت رہیں۔ میری نیک تمنائیں ''ارژنگ'' کے کبھی بہی خواہوں کے لیے۔والسلام

ممتاز راشد لاہوری

برادر عزیز! تسلیمات۔

آپ نے کنفرم کیا ہے کہ میرا گزشتہ عریضہ آپ تک نہیں پہنچا۔ سچی بات ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں کہ آپ کو کیا کیا بھجوایا تھا۔صرف اتنا یاد ہے بھجوایا تھا اور اپنے ہاتھ سے پوسٹ کیا تھا۔

پرچہ ماشاءاللہ ۔آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے...... کی مانند خوب ہے۔ بلکہ اب تو یہ شمارہ خاص شمارے کے طور پر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ بہت مبارکباد۔

آذر بھائی کی سالگرہ 25 دسمبر کو ہوتی ہے۔ ممکن ہوتو آنے والے شمارے میں مرسلہ نگارشات شامل کرلیں۔ممنون ہوں گا۔

ویسے آذر بھائی کا آخری انٹرویو بھی ارژنگ ہی کی زینت بنا تھا۔جو عزیزی عامر بن علی کی کاوش تھی۔خدا کرے یہ ڈاک آپ تک پہنچ جائے۔

جملہ اراکین ادارت کی خدمت میں آداب۔ آپ نے ایس ایم ایس میں اپنا ایڈریس بھجوانے کا حکم دیا تھا، حاضر ہے۔ اپنی دیگر مطبوعات سے نواز سکیں تو ممنون ہوں گا۔

بہت احترام کے ساتھ

افتخار مجاز

محترم ومکرم! جناب ناز اوکاڑوی صاحب!

سلام مسنون! اس مرتبہ ارژنگ نہیں ملا۔کوئی ناراضگی ہوگئی ہے یا یہ نامہ برکوخوش آ گیا!

بہر حال ارژنگ کے لیے تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔آخر میں میرا، اصغر مغل اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام!

دعا گو

احمد جلیل

برادرم حسن عباسی/محترم ناز اوکاڑوی

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ بہت شکر گزار ہوں۔اپنی ایک تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔دلی طور پر سلام قبول فرمائیں۔

خیراندیش

آفتاب خان، لاہور

ہر زبان کا اعلیٰ ادب آپ کے اندر ایک تخلیقی تحریک کو بیدار کرتا ہے۔

ہر اچھے ادیب شاعر کو لازماً ایک اچھا اور متنوع موضوعات کا قاری ہونا چاہیے۔

انٹرویو: ڈاکٹر کوثر محمود

شرکائے گفتگو: حسن عباسی • سلیم گورمانی • سمندر منصوری

کچھ خوشامدی اور چاپلوس لوگ، ان پڑھ اور کندۂ ناتراش حکام سے کچھ نہ کچھ اپنے استحقاق سے بڑھ کر لے مرتے ہیں

حسن عباسی: اپنے علمی و ادبی کام کے حوالے سے کچھ بتائیں۔

ڈاکٹر کوثر محمود: ابھی تک شاعری کی صرف ایک کتاب، ''کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو'' اور موپاساں کی فرانسیسی کہانیوں کے اُردو ترجمے پر مشتمل ایک مجموعہ بعنوان ''موتی گیند زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ باقی بہت سا کام ہے کہ جو ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، بہر حال پنجابی شاعری کا مجموعہ ''چو کھیا دیوا'' مکمل ہے اور اُردو شاعری کا مجموعہ ''صبحِ جمال کی پہلی ساعت'' وہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔ علاوہ ازیں ''اردو شاعری میں خوشبو کا استعارہ'' کے نام سے ایک ضخیم مقالہ اور ''میرے دوستوں کی نظمیں'' کے عنوان سے تنقیدی و توضیحی مضامین کی کتاب بھی تیار ہے دیکھئے کب چھپنے کی نوبت آتی ہے۔

حسن عباسی: آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: بھئی مجھے کسی نظریے کا تو نہیں پتہ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اُس نے جس سے جو کام لینا ہے بڑے سلیقے سے لے لیتا ہے اور جس کو پذیرائی دینی ہو اُسے مل بھی جاتی ہے، کس سے عجلت کا معاملہ کرنا ہے کس کو وعدۂ فردا پہ رکھنا ہے؟ اس کی بھی اُسے ہی خبر ہے، ہمیں بس جو کام، جیسا بھی آتا ہے کرتے رہنا چاہیے۔

حسن عباسی: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چند افراد نے ادب کے ہوائی جہاز کو ہائی جیک کر لیا ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: ویسے مجھے بتائیں کہ ہوائی جہاز کو ہائی جیک کرنے والے کیا ہمیشہ اُسے اپنے زیرِ تصرف رکھ سکتے ہیں؟ اپنے وقتی مفادات کو پورا کرنے کے بعد وہ اس سے دستبردار ہو ہی جاتے ہیں اور سورج کو کتنی دیر چھپایا جا سکتا ہے؟ اس طرح کے لوگ ہر دور میں رہے ہیں۔ ان کا رویہ بالعموم ایک سا ہی ہوتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح دنیا کی تمام ایئر لائنز کے تمام جہاز ہائی جیک نہیں ہو سکتے صرف چند ایک کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے اسی طرح کچھ خوشامدی اور چاپلوس لوگ، ان پڑھ اور کندۂ ناتراش حکام سے کچھ نہ کچھ اپنے استحقاق سے بڑھ کر لے مرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑی آسان سی پہچان ہے، یہ لوگ کسی سرکاری منصب کو اپنے لیے وجہِ فضیلت جانتے ہیں۔ حالانکہ سرکاری مناصب کی قدر و وقعت اہلِ علم کے قبول کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ یہ مناصب اُن کی قدر و منزلت کو بڑھاتے ہیں۔

حسن عباسی: گزشتہ کچھ عرصے سے ادبی محافل سے دور رہنے کی کیا وجہ ہے؟

ڈاکٹر کوثر محمود: پیر و مرشد علامہ اقبالؒ کے بقول:

تیری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

کوئی محفل اس قابل ہوگی تو ہم سر کے بل پہنچیں گے اور کوئی ہمیں اس قابل سمجھے گا تو زبردستی گھسیٹ کر لے جائے گا۔

حسن عباسی: کیا گزشتہ کچھ دہائیوں سے پاکستان میں نظم اچھی لکھی جا رہی ہے یا غزل؟

ڈاکٹر کوثر محمود: اچھی نظم بھی لکھی جا رہی ہے اور اچھی غزل بھی لکھی جا رہی ہے لیکن ہر دو اصناف میں کم کم اچھا لکھا جا رہا ہے۔ اکثر لوگ مقبولِ عام روش کو اپناتے ہیں اور بہت کم اپنی روش کو مقبولِ عام بنانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ بہر حال اس بارے میں کوئی فوری اور قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

اکادمی ادبیات پاکستان اور ادارہ خیال و فن کے اشتراک سے

عامر بن علی کے اعزاز میں تقریب

ممتاز راشد لاہوری، محمد جمیل، عامر بن علی، حسن عباسی، شازیہ نورین (جرمنی)
اور اقبال راہی خصوصی نشست پر براجمان ہیں

شازیہ نورین (جرمنی) عمرانہ مشتاق، عامر بن علی
اور اقبال راہی مقالہ جات سنتے ہوئے

تقریب کے منتظم ممتاز راشد لاہوری اور ڈاکٹر صغرا صدف سے
عامر بن علی پھول وصول کرتے ہوئے

اکادمی ادبیات کے سابق چیئرمین فخر زمان کی شرکت اور حسن عباسی
اور راجہ نیر کی گفتگو نے تقریب کا حسن دوبالا کر دیا

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull